اگنی پریکشا
(افسانے)
نعیم کوثر
قیمت Rs-/150

ملک میں جو کچھ ہورہا ہے اگر وہ ادیب و شاعر کے آدرشوں اور تصورات سے ہم آہنگ ہے اور اُسے اِس میں اپنے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں تو اس کا ''دُور کا تماشائی'' بنا رہنا اس کے خلوص کی جو ادب کی بنیادی شرط ہے، غمازی نہیں کرتا اور اگر جو کچھ ہورہا ہے وہ اس کے تصورات کو چکنا چور کردیتا ہے تو اس کے خلاف جدوجہد نہ کرنے اور اس کی تخلیقات میں اس کا اظہار نہ ہونے سے ادیب کے منصب پر حرف آتا ہے۔

عابد سہیل

ماہنامہ ''کتاب'' لکھنو تمبر ۱۹۶۵ء

Surkhab Publication
Opp.Post Office
Qamri Marg,Ujjain
Mob.09752797208

اَگنی پَریکشا

(افسانے)

نعیم کوثر

"AGNI PARIKSHA"
(Short stories)
by
NAEEM KAUSAR
Year of edition 2009
Price-Rs.150/-

نام کتاب : اگنی پریکشا۔
مصنف : نعیم کوثر
سنِ اشاعت : ۲۰۰۹ء
کمپوزنگ : محمد نعیم انصاری، بھوپال، موبائل:۔ 9300989834
قیمت : ایک سو پچاس روپے
تعداد : ۴۰۰
صفحات : ۱۶۰
سرورق : عبدالحمید گوہر
مطبع : سُرخاب پبلیکیشنز، انڈاگلی، اوجین۔ Mo.:9752797208
ملنے کا پتہ : ''صدائے اردو'' ۳۱، شملہ ہلز، فردوس، کامیج، بھوپال۔ 462002
موبائل نمبر : 09893731471

انتساب

میں اپنے اس افسانوی مجموعہ کو عصرِ جدید کے ممتاز افسانہ نگار اور صحافی جناب **عابد سہیل** کے نام معنون کرتا ہوں جن کے افسانے زندگی کی گہرائیوں میں اتر جانے کی جستجو میں رہتے ہیں اور جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد سے آج تک انھیں نظریات پر ثابت قدم ہیں۔

نعیم کوثر

فہرست

نمبر شمار	نام افسانہ	صفحہ نمبر
1	نورنگی	5
2	بلی کی گھنٹی	16
3	قیامت کے دن	26
4	بجو کا شکر گنجی	35
5	چوزہ	47
6	دو بوند زندگی کی	56
7	پرائشچت	64
8	نروان	77
9	جرمن شیفرڈ	88
10	مٹھو چتر کوٹی	97
11	فتح قریب ہے	112
12	نئے ویرانے	122
13	اگنی پریکشا	131
14	کتبے کی فریاد	141
15	پاک دامنی	149
16	کوائف	159

☆☆☆

نورنگی

بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ نرس اور ڈاکٹر کھال کے نیچے گوشت کو تلاش کرتے رہے لیکن انجکشن کی باریک سوئی طوطے کی چونچ کی طرح پنجرہ کی آہنی تیلیوں سے ٹکراتی رہی۔ دانت مسوڑھوں کو تنہا چھوڑ چکے تھے۔ سفید بال چھوٹے سے سر پر مکڑی کے جال جیسے سمٹ کر الجھ گئے تھے مانو ٹین کے کنستر میں گڑیا کے بال۔ مٹھی میں دبوچ لو تو ہتھیلی میں بکھری لکیروں میں کھو جائیں۔ زرد ستے چہرے کی جھرّیاں بیتے دنوں کی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں جہاں لعن طعن، شک وشبہ اور الزامات کے ان گنت سنگریزے چھپے ہوئے تھے۔ دھنسی آنکھیں مدھوکھیوں کے سوکھے چھتے جیسی ویران تھیں۔ آدھے گھنٹے جانچ کے بعد ڈاکٹر جان کُرسی پر بیٹھ گیا رومال سے چہرہ صاف کیا اور آفتاب میاں سے بولا۔

''کوئی امید نہیں۔ دونوں گردے ختم ہو چکے ہیں۔ ڈائلاسس پر رکھنا ہوگا۔ پھر بھی کہہ نہیں سکتا کب تک سانس چلے''۔

آفتاب میاں نے آنسوؤں کو روکا۔ کوٹ کی جیب سے چیک بک نکالی۔ نرسنگ ہوم لکھا، دستخط کیے اور چیک پھاڑ کر ڈاکٹر کی ٹیبل پر رکھ دیا۔

''میرے فنڈ اور گریجویٹی کے پانچ لاکھ جمع ہیں۔ اگلے ماہ بیٹی کی شادی ہے۔ رقم بھر لیجیے گا مگر علاج میں کوئی کسر نہ رہے۔''

بڑے کشادہ چھ کمرے۔ لمبے دالان اور وسیع آنگن، اس زمانے میں ایسے مکان کو کوٹھی کہا جاتا تھا۔ بھیا افضل شہر کے نامی تاجر تھے۔ آٹھ چشمی دوکان اس سڑک کے وسط میں تھی جو نواب ریاست کے قصر سلطانی سے چار میل کا فاصلہ طے کرتی اور گنجان آبادی سے لہراتی بل کھاتی گزرتے ہوئے ریلوے اسٹیشن پر دم توڑ دیتی۔ بھیا افضل کے دادا سہارنپور سے سو اشرفیاں لیے آئے تھے اور یہاں آباد ہو گئے۔ آہستہ آہستہ اپنے کاروبار کو اتنی ترقی دی کہ وہ ریاست کا پہلا اور واحد ڈپارٹمنٹل اسٹور بن گیا۔ ایک صدی تک ان کے بیٹوں اور پوتوں نے محنت، ایمانداری اور لگن سے خوب دولت کمائی۔ ملک کے دو ٹکڑے کیا ہوئے کہ اس خاندان میں بھی بکھراؤ ہو گیا۔ بھیا افضل کے دونوں بھائی اپنا اپنا حصہ لے کر سرحد پار کر گئے۔ ان کی ماں اور وہ اکیلے رہ گئے۔ اماں نے ٹھنڈی سانس لی اور بیٹے کا حوصلہ بڑھایا۔

''بیٹا دولت زندگی کے آرام کے لیے ہوتی ہے مگر زندگی دھن جمع کرنے کے لیے نہیں ہے۔ جو کچھ بچا ہے اسے سنبھال کے استعمال کرو۔!''

مگر نقصان کی چھلنی کے سوراخ پھیلتے گئے۔ عزت اور برکت نے بھیا افضل کی چوکھٹ سے آنکھیں چرانا شروع کر دیں۔ ریاست کے پرانے افسر جاگیردار اور بڑے گھرانے نئے ملک کی طرف دوڑ پڑے۔ مرکزی سرکار نے چیف کمشنر بھیج دیا اور اسے وہ تمام اختیارات حاصل ہو گئے جو نواب کو حاصل تھے۔ پرانے قاعدے قانون، عدلیہ پولس اور انتظامیہ غرض سب کچھ بدل گیا زبان نئی چلی تو فائلوں کی رفتار اور چال بھی پرانی ڈگر سے پھسل گئی۔ یوں سمجھ لو کہ سارے کے سارے پُرانے نظام نے کینچلی اتار پھینکی۔

بھیا افضل کے سامنے ملک کے ٹکڑے ہوئے بھائیوں نے منہ موڑا، پرانی

تہذیب، اقدار اور رواداری کی عمارت بھی لڑکھڑا گئی ادھر سے جانے والے اور ادھر آنے والے بربادی اور قتل و غارتگری کی ایسے افسانے چھوڑ گئے اور لے آئے جن کا لفظ لفظ خون میں ڈوبا ہوا تھا جو آنے والی نسلوں کی پیشانی پر مہابھارت کے تیروں جیسا گھاؤ لگاتے رہیں گے۔ بھیا افضل کی حالت اس جہاز جیسی ہوگئی جس کی تلی میں سمندر کے بیچوں بیچ گز بھر کا چھید ہوگیا ہو۔

آئی۔سی۔یو وارڈ میں دائیں کنارے کے بیڈ پر نورنگی بائی نیلی ساڑھی میں لپٹی سوکھا گلدستہ نظر آرہی تھی۔ سوتی ساڑھی دھل دھل کر جتنی بھی سکڑنا تھی سکڑ چکی تھی اور ایسا ہی حال نورنگی کا تھا کہ بھیا افضل، ان کی اماں اور بیگم کی خدمت کے بعد آفتاب میاں کی دیکھ ریکھ اور پرورش میں پچاس سال بتا دیئے۔ اس کا تھکا ماندہ جسم اور ساڑھی ایک دوسرے میں کھوگئی۔ پنکھے کی ہوا سے ساڑھی جگہ جگہ سے اڑتی، لہراتی اور نورنگی کی کھال میں الجھی ہڈیاں آواز کیے بغیر شرما سی جاتیں۔ ایک مہینے پہلے اسے ملیریا سے چھٹکارا ملا تھا۔ وہ دو دن سے نرمل نرسنگ ہوم میں نامی گرامی ڈاکٹروں کے زیر علاج تھی۔ ایسے ایسے ڈاکٹر کہ جن کو گھر بلائیں اور فیس دیں تو مریض کے گھر والے چار دن فاقہ کریں۔ چار سال پہلے آفتاب میاں اس کے لیے نئی مچھر دانی لائے تھے۔ اتنے عرصے میں نئی نویلی دلھن کا رنگ روغن اتر جاتا ہے پھر بھی اُدھڑتی مچھر دانی میں نورنگی کے کمزور ہاتھوں نے جگہ جگہ پیوند لگا لیے مگر مچھروں نے اسے بیمار کر ہی دیا۔

ڈاکٹر جان نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چیک دیکھا، اٹھایا اور ٹیبل گلاس کے نیچے دبا دیا جہاں میڈیکل ریپریزینٹو کے بے شمار رنگین کارڈ پہلے سے سجے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے دوسرے ماہرین کو بھی بلا لیا۔ سب ہی نے نورنگی کے بے جان جسم کی ہر طرح جانچ کر لی اور ڈوبتی نبضوں سے انگلیاں اٹھا لیں۔

''نو ہوپ۔ شی اِز آل موسٹ ڈیڈ!'' ڈاکٹر نورنگی کا سینہ ڈھانپ کر اپنی

کرسی پر آبیٹھا۔ پندرہ منٹ گزرے ہونگے کہ اس نے نورنگی کی آخری ہچکی سنی، جیسے بہت دور جھینگر بولا ہو۔ ناک کی لونگ کا چھوٹا سا سفید نگ صبح کے ستارے جیسا پھیکا پڑ گیا نرس نے آہستہ سے نورنگی کو سفید چادر سے ڈھانپ دیا۔

بھیا افضل کی شادی شاہی محل کے واٹر ورکس انجینئر اسلم مرزا کی بیٹی شاہدہ سے ہوئی تھی۔ ان کے والد اپنی بہو کو وداع کر کے لائے تو مالن کی جوان ودھوا بیٹی نورنگی بھی کوٹھی میں آگئی۔ کہنے کو مالن کی بیٹی تھی مگر اس کا باپ ذات کا کائستھ اور چھوٹے نواب کی ڈیوڑھی میں دربان تھا۔ چھوٹے نواب بمبئی کے پڑھے لکھے شوقین مزاج تھے اور کئی معمولی کارندوں کو کاشتکاری کے لیے سینکڑوں ایکڑ زمین بخش دی تھی۔ زمانہ ہی ایسا تھا راجے مہاراجوں اور نوابوں کی ریاست میں لڑکیاں زیادہ ہی پیدا ہوا کرتی تھیں۔ نورنگی بھی گوری چٹی اور سڈول تھی۔ چودہ سال کی عمر میں بیوہ ہوگئی۔ اس کا باپ دربان ضرور تھا، لیکن بڑا غیور اور غیرت مند۔ چھوٹے نواب کے گر گے اس کے قدموں کو ذرا بھی ڈگمگا نہ پائے۔ شاہدہ بیگم نے ضد کی تو اسلم مرزا نے نورنگی کو اس کے باپ سے مانگ لیا۔ تب ایسا چلن تھا کہ رؤسا اپنی لاڈلیوں کے ہمراہ ان کے مزاج اور عادتوں سے واقف کسی نہ کسی خادمہ کو سسرال بھیج دیتے تھے۔ یہ لڑکے والوں کی مرضی ہوتی کہ اسے گھر میں بسا لیں یا مہینہ پندرہ دن میں واپس کر دیں۔ شروع میں بھیا افضل کی اماں کو نورنگی ایک آنکھ نہ بھائی کہ بیوہ ہے اور جوانی کی بھٹی میں تپ رہی تھی۔ مگر دلھن بہو کی بات بات میں بیٹے کی سانسوں کی مہک سونگھ وہ خاموش بیٹھ گئیں۔

''امی جان۔ نورنگی میری جان ہے''! شاہدہ نے جاگیردارانہ تمکنت سے اماں کے ہونٹوں کو سی دیا۔ شاہدہ خود ان کی پسند سے دلھن بہو بن کر آئی تھی۔ اس کی بات ٹالنے کی ان میں نہ ہمت تھی نہ حوصلہ۔ دلھن بہو نے سر جھکائے بچپن سے اب تک اپنی اور نورنگی کی ڈھیر ساری کہانیاں سنا دیں۔ گڈّ اگڑیوں اور رات گئے

تک گپ شپ لڑانے کی!

بھیا افضل کی ماں اس دن چھاتی کوٹ کوٹ اتنا روئیں کہ ساون بھادوں کی جھڑیاں زمین چھونے سے کترا گئیں۔ موٹے تازے تندرست آفتاب میاں نے جنم لیا۔ دایہ دادی بچے کو سنبھالنے میں مصروف ہوئیں اور پندرہ منٹ بعد دلھن بہو نے لمبی ہچکی لے لی۔ لاکھ جتن کئے مگر سانس بھی بھلا کوئی بچہ تھی کہ صبح کا بھولا جیسے شام کو گھر لوٹ آتی۔ پوتے کو تولیئے میں لپیٹے بھیا افضل کی اماں روتی چلاتی اپنی سمدھن کے کمرہ میں جا گھسیں جو سارے سازو سامان کے ساتھ بیٹی کی زچگی کی خاطر دو دن سے ڈیرہ ڈالے ہوئے تھیں۔ دونوں کی آہ و بکا نے محلّہ بھر کو ہلا کر رکھ دیا۔

دلہن بہو کا چالیسواں ہوا اور بھیا افضل کی اماں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''بیٹا افضل۔ تمھارے ابا نے زمین جائداد کی کوئی وصیت نہیں کی تھی بس نورنگی کو لوٹانے کا ضرور کہہ گئے تھے۔!'' بھیا افضل خاموش بیٹھے رہے تین ماہ پہلے سلیز ٹیکس اور انکم ٹیکس کا بقایا اور جرمانے چکانے کی خاطر دوکانیں معہ سامان بیچ دیں۔ خاندان کی بچی کھچی عزت بچ گئی مگر بالکل کنگال ہو گئے۔ ادھر شاہدہ کی موت نے کمر جھکا دی۔ اور اب آفتاب میاں کی پرورش کا بوجھ جو کوئلہ سے لدی مال گاڑی کی طرح ان کے دماغ پر دھڑ دھڑ دوڑ رہا تھا۔

''منحوس ہے وہ۔ پہلے ہی کہا تھا دلھن بہو اور نیچ ذات کی بیوہ کا کوئی جوڑ نہیں۔ تم خاموش رہے، تب ہی لوٹا دیتے!''

بھیا افضل اٹھ کھڑے ہوئے۔ دور کمرے مین نورنگی آفتاب میاں کا جُھولا آہستہ آہستہ ہلا رہی تھی۔ وہ اپنی کوٹھی کے اکلوتے وارث تھے برسوں سے جما ہوا کاروبار اور دوکانیں کھونے کے بعد انھیں خاندانی کوٹھی بھی ٹوٹی شاخ پر مرجھائے

بکھرتے پھول جیسی دکھائی دی۔ انھوں نے ہمت بٹوری اور بول پڑے۔

''کبھی نہیں اماں۔ ایسا سوچیئے بھی مت۔ نورنگی یہیں رہیگی!

ہرسُو پہلے ہی سے اداسی اور مردنی چھائی تھی۔ بھیا افضل نے بے خوفی سے نافرمانی کا بم پھوڑا اور سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ہونٹ سوکھ گئے اور زبانیں تپتے توے پر روٹی جیسی جل گئیں۔ کس میں ہمت تھی جو حیل حجت کرتا۔ ممتا لاکھ پربت جیسی مضبوط ہو لیکن سر سے پیر تک کنگارو کے پیٹ جیسی بلکتی اور بے چین رہتی ہے۔ ایک تو بیوہ، دوسرے بیٹے کا بے وقت رنڈاپا اور پوتے کی گود چھن جانے سے بھیا افضل کی اماں سر جھکا کر رہ گئیں اور سوتے جاگتے نورنگی کا ٹینٹوا دبانے کوا تارو رہنے لگیں۔ آفتاب میاں کو اس کی گود میں دیکھتیں تو دل مسوس کر بیٹھ جاتیں اور بڑبڑاتی رہتیں۔

''منحوس۔ چمگادڑ جیسے لٹکی ہوئی ہے ہماری جان پر!''

''افضل کے ابا کو ٹی۔ بی۔ کھا گئی''!

''دلھن بہو چٹ پٹ ہو گئی! کاروبار چوپٹ ہو گیا''!

''اس ناس مٹی پر بجلی نہیں گرتی!

''نکال باہر کرو اس چنڈال کو!''

نورنگی بائی دو سال سے کوٹھی کی خوشیوں اور دکھوں کو جھیل رہی تھی۔ عورت کسی بھی دھرم اور ذات کی ہو وہ کسی کی بھی خوشی دیکھتی ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود خوش ہے۔ دوسروں کے دکھ آنکھوں میں ناچتے ہیں تو وہ خود بھی دکھی ہو جاتی ہے۔ بھیا افضل کے ساتھ شاہدہ بنارسی ساڑھی اور موگرے کے پھولوں سے لدی خوشبو بکھیرتی آئی تو اس کا رواں رواں شادیانوں سے تھرک اٹھا۔ آفتاب میاں نے جنم لیا اور وہ سارے آنگن میں ناچتی پھری۔ شاہدہ نے دنیا سے منہ موڑا تو نورنگی پرانے کاغذ کے ٹکڑے کی طرح بگولے میں گردش کرنے لگی۔ اب بھیا افضل

کی اماں کے چتونوں کی کٹار دن رات اس کے معصوم دل کو چھید نے لگی ۔ ان کا ہر لفظ گھی میں تر ہو کر اس کے جسم کو چتا کی آگ میں جھلسا نے لگا ۔

نو رنگی ماں نہیں تھی لیکن گھٹنوں کے بل چلتے چلتے ایک دن آفتاب میاں کی نازک کھال فرش سے رگڑ کھا گئی تو وہ بری طرح چیخ اٹھے ۔ ان کی آنکھیں اور دونوں ہاتھ نو رنگی کی طرف اٹھ گئے ۔ ہر بچہ جانتا ہے کہ ماں ہی اس کے درد کو سمجھ سکتی ہے ۔ نو رنگی گھبرا کر آفتاب میاں کی طرف دوڑ پڑی ۔ لیکن اس سے پہلے ہی بھیا افضل کی اماں نے انھیں گود میں اٹھا لیا ۔ اور لگیں دلارنے، تھپکیاں دینے ۔ مگر آفتاب میاں چپ ہی نہ ہوئے ۔ اماں پسینہ میں نہا گئیں ۔ بوڑھے ہاتھ کی رگیں پھول گئیں ۔ ہتھیلیوں میں سوجن آ گئی ۔ ساتھ میں نو رنگی دودھ کی بول لیے لٹو جیسے گھوم رہی تھی ۔ اس کا بھی کلیجہ پھٹنے کو آیا تو ہمت دکھائی ۔

''بیگم صاحبہ ۔ ذرا مجھے دیدیں''

نہ چاہتے ہوئے بھی بے بسی سے کانپتے ہوئے تھکی ہاری بھیا افضل کی اماں نے پوتے کو نارنگی کی گود میں ڈال دیا اور سر تھام کر تخت پر بیٹھ گئیں ۔ نو رنگی آفتاب کو چکی کے پاٹ جیسی مضبوط چھاتی سے لپٹائے اس کمرے میں جا پہونچی جہاں دلھن بہو کی زچگی ہوئی تھی ۔ بوتل پلنگ کی پٹی پر رکھی اور لیٹ گئی ۔ جھٹ سے ساڑھی کا پلو ہٹایا، بلاؤز میں سے اپنا پستان نکالا اور آفتاب میاں کے منہ میں دیدیا ۔ آفتاب میاں نے بند آنکھوں اور رسیلے ہونٹوں سے پہلی بار ممتا کے امرت کو چکھا ہوگا ۔ پل بھر میں ہر طرف سناٹا چھا گیا ۔ کچھ دیر پہلے آیا بھونچال تھم گیا ۔ آفتاب میاں گوشت کے اس لوتھڑے سے آشنا ہو گئے جہاں سے زندگی کا چشمہ پھوٹتا ہے ۔ جس کی بوندیں پیغمبروں اور اوتاروں نے بھی چکھیں اور چنگیز ہلاکو نے بھی حلق سے نیچے اتارا ۔

آفتاب میاں خاموش ہوئے تو ان کی دادی کے دل میں وسوسے انگڑائی لینے

لگے۔ نورنگی نے کون سا جادو کر دیا۔ وہ تیزی سے کمرے میں گھستی چلی آئیں اور ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی۔ پاؤں تلے کی زمین کھسک گئی۔ سارا جسم مفلوج سا ہو گیا۔ ہاتھوں کی جھرّیاں خون سے لبریز ہو گئیں اور وہ پوری طاقت سے چلائیں۔

''افضل بیٹے۔ جلدی آیئے۔! وہ بھیّا افضل کو کوٹھی کے اندر آتے دیکھ چکی تھیں۔ وہ گھبرائے ادھر کو بھاگے آئے۔ تب تک نورنگی نے وہ سب کچھ ڈھانپ لیا جو فساد کی جڑ تھا۔

''کیا ہوا اماں!

''غضب ہو گیا بیٹے۔ وہی بات ہے کہ جھولی میں دام نہیں
اور سرائے میں ڈیرہ۔ حرام زادی اوقات بھول گئی''!

اماں نے جو کچھ دیکھا نفرت اور غصہ کے تندور میں بھون کر سنا دیا۔ نورنگی کا جسم برگد کی جٹاؤں جیسا ڈول رہا تھا۔ چہرہ پر ہلدی رنگ چھا گیا۔ ہونٹ سفید ہو گئے۔ اسے اپنی اس غلطی کا احساس ہوا۔ جو سہارنپور کے سید خاندان کی عبادتوں پر غلیظ گندی انڈیل گئی۔ اس کی چھاتیوں میں دودھ کہاں تھا وہ پلاسٹک کی نپل جیسا آفتاب میاں کو لطف، لذّت اور سکون ضرور دے گئیں مگر ساہوکار کے پاس گروی رکھی کوٹھی میں طغیانی آ گئی۔

''نگوڑی نے خاندانی خون کو جھوٹا کر دیا''! اماں نے پسینہ میں بھیگی نورنگی کے تمتماتے گالوں پر پیر سے چپل اتار کر تڑاتڑ مارنی شروع کی تو بھیّا افضل نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

''سنیئے تو اماں!

''اب کیا رہ گیا سنانے کو'' وہ ہانپتی ہوئی بولیں۔

''حرام زادی کو ماں بننے کا شوق ہے تو مویشی کے
باڑے میں جا گو دے۔ لیٹ جائے کسی سانڈ سے''!

''اماں ۔ خدا کے لیے خاموش ہو جایئے ۔ کون سا آسمان ٹوٹ پڑا ہے ۔''
بھیا افضل گڑگڑائے ۔ ''چھوٹی سی بات کا بتنگڑ نہ بنائیں ۔''! گونگی بنی نورنگی کو اماں کی ہر بات پینچ کش سی کانوں میں گھستی معلوم ہو رہی تھی ۔ اس کے خشک ہونٹوں پر کراہیں اٹھتیں اور دم توڑ دیتیں ۔

''اس نیچ ذات نے سیّدوں کی قبر پر پیشاب کر دیا اور تم کہتے ہو بات کا بتنگڑ نہ بناؤں ؟

بھیا افضل کی اماں کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے ۔ غصہ سے ہونٹ نیلے پڑ گئے ۔ بڑھاپے اور بیوگی نے ان کے ہاتھوں کی ساری طاقت سمیٹ کر زبان میں ٹانک دی تھی اُن کا بس چلتا تو نورنگی کا گلا گھونٹ دیتیں ۔ دلھن بہو کے آنے کے بعد بھی اماں کو نورنگی کی ہوش ربا جوانی اور نشہ چھلکاتی آنکھیں ایک پل کو نہ بھائیں ۔ بھیا افضل کے ابا کچھ دن اور جیتے تو نورنگی کا جانا طے ہی تھا ۔ دلھن بہو کے انتقال کے بعد جب تک بھیا افضل گھر پہ رہتے اماں کی نگاہیں ہر وقت نورنگی کے اٹھتے قدموں کو گھورتی رہتیں ۔ ادھر کاروبار چوپٹ ہوا اور بھیا افضل کمرہ میں بند ہو کر بیٹھ گئے ۔ اماں غم سے نڈھال ضرور ہوئیں لیکن اپنی عادت سے مجبور تھیں ۔ صبح اٹھتیں اور جیسے ہی بھیا افضل گھر سے نکلتے وہ ان کے بستر کی مسکی ہوئی سفید چادر پر انگلیوں سے دھبے ٹٹولتیں ۔ بیٹے کے اتارے پائجامے کا باریکی سے جائزہ لیتیں ۔

آج بھیا افضل نے نورنگی کی وکالت میں زبان کھولی تو ان کے دماغ میں دو سال سے چبھتا شک وہ نوکیلا کانٹا حکیم لقمان کی ہڈیوں کو ٹٹولنے لگا ۔ وہ دنگ رہ گئیں اور سوچتی رہیں کہ آخر کس کے بوتے پر نورنگی نے آفتاب میاں کے بے داغ ہونٹوں اور پاکیزہ حلق میں سور کی تھوتھنی ٹھونس دی ۔ اماں نے بیٹے اور پوتے کی محبت میں کئی بار خون کے گھونٹ پیئے ۔ اُن کو روتے دیکھ بھیا افضل ان کے پاس آ بیٹھے ۔ نورنگی سر جھکائے دوسرے کمرے میں چلی گئی ۔

''اماں۔ آپ کو آج بتا دوں۔ شاہدہ نے قسم چڑھائی تھی لیکن کیا کروں بتانا ہی پڑے گا۔ اماں۔ شاہدہ نے چار مہینے نورنگی کی ماں کا دودھ پیا تھا اور میری سسرال والوں نے اسے راز ہی رکھا!''

''ہائے اللہ'' اماں بوکھلا گئیں۔ یہ کیا کفر بک رہے ہو توبہ توبہ!'' مجھے موت دیدے پروردگار میری بہو بھی''۔ وہ سر کے بال نوچنے لگیں۔ پاؤں زور زور سے فرش پر مارتے ہوئے کمرہ سے باہر نکل گئیں۔ شاید یہ راز انکا بڑھاپا ہضم نہیں کر پایا اور باقی عمر گھٹ گھٹ کر اپنا خون پانی کرتی رہیں۔ جب وہ گزر گئیں تو بھیا افضل نے ساہوکار کا قرض چکانے کے لیے کوٹھی اس ہی کو فروخت کر دی اور شہر کے باہر دو کمروں کا مکان کرایہ پر لے لیا۔ نورنگی اور آفتاب میاں کے ساتھ وہاں اٹھ آئے۔

سوال ذرا الجھا ہوا تھا۔ آفتاب میاں نے ساری الجھنوں پر لعنت بھیجی ایمبولنس میں نورنگی کی لاش رکھی اور سیدھے گھر آئے۔ سرکاری ملازمت سے رٹائر ہوئے چھ مہینے ہوئے تھے۔ بیوی کو سمجھایا۔ دونوں جوان بیٹوں کو ایک ہی بات کہی۔

''یہ لاش جب زندہ تھی تو تم نے خود دیکھا تمھارے ابا اور امّی نے اس کی کتنی خدمت کی۔ دادا نے مجھے ان ہی کی گود میں ڈال دیا تھا۔ امّی نے تمھیں سب کچھ بتا دیا ہوگا''!

''ابا ہمیں کچھ نہ سمجھایئے۔ آپ بتائیں کیا کرنا ہے؟ قبرستان لے چلیں!''

''نہیں بیٹا۔ اس گھر سے تمھارے دادا قبرستان گئے تھے۔ یہ لاش ان کی بڑی قیمتی امانت ہے۔ اسے شمشان لے جائیں گے۔''!

آفتاب میاں کی بیوی خاموش تھیں۔ ان کا دل سب کچھ جانتا تھا۔ نورنگی بائی کی

دھنسی ہوئی چھاتی کے دو سیاہ سے بٹن ساڑھی کے جھر جھرے پلو سے صاف نظر آرہے تھے جنھیں بھیا افضل کی اماں کی غصیلی چیخ سن کر نورنگی بائی نے خوف سے چھپا لیا تھا۔ آفتاب میاں کو ذرا بھی جھجک اور خوف نہ تھا کہ آج سہارنپور کے سیّدوں کا وارث ارتھی کا بوجھ اٹھائیگا۔ ان کے دفتر کے دو پرانے چپراسی آ گئے تھے۔ تیار شدہ ارتھی اور دیگر سامان بھی آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہاتھ ٹھیلے پر نورنگی بائی کا بوجھ دو بانسوں کے سہارے رکھدیا اور سفید کپڑے پہنے انگلیوں سے سفید داڑھی میں کنگھی کرتے ہوئے آفتاب میاں پیچھے پیچھے چل پڑے ان کے دونوں بیٹے بھی ساتھ ہو لیے۔ تنہائی ہوئی تو آفتاب میاں کی بیوی ہمت کر کے نورنگی بائی کی کوٹھری میں داخل ہوگئی۔ بجلی آن کی اور ٹین کا درمیانی سائز کا پرانا بکس پلنگ کے نیچے سے باہر کو گھسیٹا۔ ڈرتے ڈرتے ڈھکن اٹھایا ان کی سانس رک سی گئی۔ بکس میں ڈھیروں مسلی ہوئی راکھیاں بھری تھیں۔ چاندی اور سونے کے تار مٹیالے ہو چکے تھے۔ گول پلاسٹک کی ٹکیوں پر بنے پھول اپنی رنگت سے محروم تھے۔ نورنگی نے جب آنکھیں کھولی تھیں تب ملک میں بسنے والوں کے دل کنول کے پھول جیسے کومل اور بے داغ تھے اور آج اس نے آنکھیں موندیں تو دل پتھر کی ان مورتیوں کی طرح ہو گئے جن کی آنکھوں کی پتلیوں میں گہرے سوراخ تھے اور ہونٹ لوہے کی چھینی سے توڑ دیے گئے تھے۔ لیکن تہذیب جل کر راکھ ہوتی ہے اور نہ ہی دفن ہوتی ہے اس کی روح زندہ رہتی ہے۔ آفتاب میاں کی بیوی اس گورکھ دھندے کو سمجھ نہ پائیں انھیں وہ الفاظ یاد آئے جو شادی کے دو دن بعد ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نورنگی نے کہے تھے۔

''بٹی۔ یا تو اللہ یا بھیا افضل اور خود میں جانتی ہوں کہ میرا دل اور انگ انگ بیابان جنگل میں بہتے اس جھرنے کی طرح ہے جس میں کسی جانور نے پیاس بجھانے کو منہ نہیں ڈالا''

☆☆☆

بلّی کی گھنٹی

مجیدن نے جلدی سے کرتا اتار پھینکا اور چھاتی تان کر کبیر کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ کچھ پل کو سورج پر بدلی چھا گئی۔ شاید اُس کی کرنیں یہ ہوش رُبا نظارہ دیکھ شرما گئی ہوں۔ اسی ادا پر کبیر فدا تھا اور اپنی فرمائش پوری کرنے کی خاطر وہ یہی حربہ استعمال کیا کرتی تھی۔

''اللہ قسم تنہائی میں بھاڑ کے چنے جیسی بھنتی رہتی ہوں۔ بلّی کا بچہ لا دیں۔ دل بھی بہلے گا اور چوہوں کے عذاب سے چھٹکارہ بھی مل جائیگا''!

مجیدن نے سوچا تھا ہمیشہ کی طرح کبیر اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیگا لیکن کبیر کو جیسے بجلی کا کرنٹ چھو گیا۔ اُس کے تیور اور آنکھوں میں چھائی غصہ کی چنگاریوں کی تپش نے مجیدن کی چھاتیوں کو چھوئی موئی بنا دیا۔ کانپتے ہاتھوں سے گھبراہٹ میں اُس نے الٹا کُرتا پہن لیا اور سر جھکائے دیوار سے ٹک گئی۔ کبیر نے نہ جانے کتنی گالیاں اُگل دیں۔ ہوا میں مُکا لہراتے اور زمین پر پیر پٹختا باہر جاتے جاتے دھمکا گیا۔

''میری چڑ بنالی ہے کم بخت۔۔۔ پہلے بھی کہہ چکا ہوں مجھے بلّی سے نفرت ہے۔ آئندہ اگر نام لیا تو خدا کی قسم مائکے پھینک آؤں گا''

کڑکتی سردی کے موسم میں بھی جب کبھی کبیر کو وہ دل دہلانے والا واقعہ یاد آ جاتا اُس کا سارا جسم پسینہ میں شرابور ہو جاتا اور اونی سوئٹر اُتار آنکھیں موند لیتا۔ وہ

چھت پر پتنگ اڑا رہا تھا کہ چودھری رام لال نے سائیکل کی گھنٹی بجائی اور چودھری روز ایسا ہی کرتا اور کبیر کا ابا جھٹ سر پہ رومال باندھتا ہوا باہر آجاتا اور دونوں ڈبل سواری غلہ منڈی کے لیے روانہ ہو جاتے۔ اُن کی گاڑھی دوستی تھی۔ گھر کی دیواریں ملی ہوئی تھیں۔ ایک ساتھ دن بھر حمالی کرنے کے بعد پسینہ پونچھتے گھر لوٹ آتے۔ گزری رات ہی انھوں نے طے کرلیا تھا کہ چودھری کا بیٹا نارائن اور کبیر اب حمالی کے کام میں لگا دیئے جائیں۔ سولہ سال کی عمریں کام کرنے کی ہوتی ہیں۔ پتنگیں اڑانے میں وقت برباد کرتے رہنے سے اچھا ہے دو پیسے کمائیں۔ کبیر نے جلدی سے چرخی میں ڈور لپیٹی اور نیچے اترنے لگا۔ ابا نے دروازہ سے قدم نکالا تھا کہ چتکبری بلی چھلانگ لگا کر اُس کے اور چودھری کے بیچ سے دوسری طرف بھاگ گئی۔

''لاحول ولاقوۃ'' دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا اور بغیر کسی ردّعمل کے وہ آگے چلے گئے۔ ماں نے کھڑکی سے یہ دیکھا اور جھٹ کبیر کے ہاتھ سے پتنگ چرخی چھین لی۔ گھبرائی آواز میں بولی۔

''ہر وقت منحوس کام میں لگا رہتا ہے۔ جا جلدی سے ایک روپیہ کے چرونجی دانے لے جا اور بابا جلال شاہ کی چوکھٹ پر رکھ آ''

کبیر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ جاتے جاتے پوچھ بیٹھا

''ماں کیا ہوگیا''

''ناس مٹی وہ بلی تیرے ابا کا راستہ کاٹ گئی''!

گھنٹہ بھر بعد کبیر لوٹا تو اپنے اور چودھری کے دروازہ کے باہر بھیڑ جمع دیکھی۔ وہ اپنی ماں کے رونے بلکنے کی آواز پہچان گیا۔ ابا اور چودھری کو منڈی کے پاس بے قابو ٹرک نے روند کر بھرتہ بنا دیا تھا۔

نئی تعمیر شدہ پُر فضا وی۔ آئی۔ پی۔ روڈ کی دائیں طرف دو قدیم مندر تھے۔ ہوائی اڈے سے راج بھون اور مکھیہ منتری نواس کو جوڑنے والی اس سڑک کا سولہ

سنگھار ہوا تو مندروں پر بھی رنگ روغن اور کنول جیسی شادابی نکھر آئی۔ کسی زمانے میں وہاں کچی پگڈنڈی تھی۔ بارش کے موسم میں تالاب پر کالے بادلوں کی مستی برستی اور پانی ٹھاٹھیں مارتا تو وہ پگڈنڈی بھی ڈوب جاتی۔ بائیں طرف شریفوں کے گھنے پیڑوں اور جھاڑیوں میں سینکڑوں سال پرانا شاہ جلال نام کے بزرگ صوفی کا مزار تھا۔ قریب ہی سوفٹ کی جگہ گھیرے چھوٹی سی کھنڈرنما مسجد ''جنات والی مسجد'' کے نام سے مشہور تھی۔ ادھر کسی کا آنا جانا نہیں تھا۔ مندروں پر جوبن آیا تو شیخ ضامن علی پر مذہب کے ساون کی بدلیاں چھا گئیں۔ وہ مراد آباد سے آتے تھے اور مقامی تاجروں سے برتنوں کے آرڈر بک کر کے لوٹ جاتے۔ انھوں نے وی آئی پی روڈ کے بائیں طرف کی ویرانی دور کرنے کی ٹھان لی۔ شاہ جلال کے مزار کی بے نوری ختم ہوئی اور آراستہ درگاہ بن گئی مسجد سے جنات غائب ہو گئے اور اذان گونجنے لگی۔ تمام تام جھام کے بعد شیخ ضامن علی نے سبز رنگ کا لباس زیب تن کیا، صافہ باندھا اور ہاتھ میں مورچھل تھام پیر و مرشد بن گئے۔ تعویز گنڈوں کا دور شروع ہو گیا۔

کبیر خاں حمال کی ماں کے گال پچکتے گئے اور ہاتھوں پر نیلگوں رنگوں کا جال اُبھر آیا۔ دانتوں نے مسوڑوں سے رشتہ ناطہ توڑ لیا۔ لہجہ میں لکنت آئی تو اس کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔ ایک ہاتھ سے چھاتی پیٹی اور دوسرے سے سر پکڑ لیا۔

''تیرے سینہ میں دل نہیں پتھر ہے کبیر۔ چولہا پھونکتے اور روٹی پکاتے میری آنکھیں پھوٹ گئیں۔ اب بس کی نہیں رہی۔ مجھ پر رحم کر اور ہاں کہہ دے!''

کبیر کی چالیس میں سے آدھی عمر اناج کے بھاری بورے ڈھونے میں بیت گئی تھی۔ بیوی کا بوجھ اٹھانے سے کئی بار ماں سے انکار کر چکا تھا۔ اب ماں کے آنسوؤں نے اس کے دل کو جھنجھوڑ دیا۔

''اچھا اماں جیسی تمھاری مرضی!

پڑوسی نارائن کی بیوہ موسی کو ماں نے شادی کی خبر سنائی تو وہ حیران رہ گئی۔

''کبیر راضی ہو گیا چاچی؟ کہاں سے لا رہی ہو بہو۔؟ نام تو بتا دو''!

''مجیدن نام ہے۔ باپ سبزی کا ٹھیلہ لگاتا ہے۔ ماں بیٹی گھر میں بیڑیاں بناتی ہیں!''

''ہائے رام۔ کنجڑی سے بیاہ کر رہی ہو؟

''تو کیا ہوا؟۔ دیکھو گی اور دیکھتی رہ جاؤ گی۔ ٹماٹر جیسی لال سرخ ہے۔''

ماں نے گھمنڈ سے انگلیاں نچاتے جواب دیا۔ ماں نے سچ ہی کہا تھا۔ کالونی کی عورتیں دانتوں تلے انگلیاں دبا مجیدن کو تکتی رہیں۔ گالوں کی سرخی میں ستارے ناچ رہے تھے لانبے سیاہ بال پتلی کمر پہ ناگن جیسے جھولتے تھے۔

''دیکھ لا جونتی۔ شربتی گیہوں ہے کبیر کی دلہن!

''اب کہاں ملے ہے شربتی۔ چیل کا موت ہو گیا۔ نہ جانے چاچی کو کیسے ہاتھ لگ گئی''!

جتنے منہ اتنی باتیں۔ ماں کے کانوں میں بانسریاں بج رہی تھیں۔ سوکھی چھاتیوں سے شہد کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ وہ غربت اور بیوگی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سے بھاگ نکلی اور مجیدن کو کبیر کی خوشیاں سونپ کر چھوٹے کمرہ میں اللہ اللہ میں مصروف ہو گئی۔ ماں کی ممتا ہر دم خواہشوں کی مالا جپتی ہے۔ بہو کو آئے تین ماہ بھی نہ ہوئے تھے کہ اُس کے اعصاب پر پوتے کی چاہت رینگنے لگی۔ ہر وقت مجیدن کے پیٹ پر گدھ کی طرح آنکھیں گاڑے رہتی۔ وہ آنگن کی نالی صاف کرنے بیٹھتی، ادھر ماں خوشی سے پھول جاتی۔

''بہو۔ کیا اُلٹی آ رہی ہے؟ جواب کا انتظار کئے بغیر دوپٹہ پھینک ننگے پاؤں وہاں آ دھمکتی۔ مجیدن کی کمر سہلاتی۔ تبھی مجیدن بڑھاپے کا چونچلا دیکھ زور سے ہنس دیتی۔ ماں برا سا منہ بناتی جیسے بہو کی مسکراہٹ اس کے چہرے پر کیچڑ پھینک رہی ہو۔

''نہیں اماں۔ ان کیچوؤں کو باہر دھکیل رہی ہوں''

ماں جھینپتی کھسیائی پلنگ پر آ بیٹھتی، کبیر کو دھیمی آوازیں برا بھلا کہتی کہ بیس سال شادی سے انکار کے سوا کچھ نہ کہا۔ اب چالیس سال کی عمر میں ارمانوں کو جگایا ہے۔ پہلے ہاں کر دیتا۔ اب تک دو چار پوتا پوتیوں سے آنکھیں سینک آخرت سنوار چکی ہوتی۔ حسرتوں کے پتنگے بھسم ہوتے ہی سجدہ میں پیشانی رگڑتی۔ دعائیں مانگتی کہ اللہ بہو کے پیٹ میں کیچوے کی سرسراہٹ پیدا کر دے۔ مہینے تیزی سے سالوں میں کھوتے گئے۔ بہو نالی پہ بیٹھتی رہی مگر ماں کے کانوں سے اُلٹی کی کھٹی آوازیں نہ ٹکرائیں۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ ایک دن دوپہر میں ماں کی تمام دعائیں خون بن کر منہ سے نکل پڑیں۔ سارا بستر لال ہوگیا۔ وہ اوندھی ہوئی تو مجیدن چیختی دوڑی آئی۔ بڑی مشکل سے ماں کو سیدھا کیا لیکن ماں کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں اور جسم برف جیسا سرد ہوگیا تھا۔

گھر کے دونوں کمروں میں ویرانی پسر گئی۔ آنگن میں دھول اُڑنے لگی۔ اکیلے پن نے مجیدن کو ڈنک مارنا شروع کیا اور اس کے گالوں کی سرخی پھیکی پڑ گئی۔ اس کی حالت دیگچی میں اُبلتے انڈے جیسی ہوگئی جو اچھلتا تو ہے مگر باہر نہیں آپاتا یہاں تک کہ چھلکا جگہ جگہ سے اکھڑنے لگتا ہے۔ اتنے سالوں بعد ہونٹوں پر کبیر سے چھوٹی سی چیز مانگنے کی طلب بیدار ہوئی۔

''اے جی۔ سارے گھروں کے چوہے ہمارے ہاں آبسے ہیں۔ تم منڈی چلے جاتے ہو اور میں دیواروں کو تاکتی رہتی ہوں۔ مجھے ایک بلی لادیں۔ اسی سے جی بہلاتی رہوں گی''!

کبیر کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ چہرہ کا رنگ لال گیا۔ اسے لگا کہ دماغ پر کوئی کیل ٹھونک رہا ہو۔ اپنے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''نا نا مجیدن۔ توبہ کر۔ مجھے بلّی سے نفرت ہے۔ تیرا من گھبراتا ہے تو نارائن کے ہاں گپ لڑانے چلی جایا کر۔ وہاں موسی ہیں۔ نارائن کی

پھول جیسی بہنیں ہیں''

ماں کا چہلم ہوا اور کبیر نے بابا جلیل شاہ کی درگاہ پر ہر جمعرات کو حاضر دینا اپنا معمول بنالیا۔ شیخ ضامن سے تعویز لئے اور مجیدن کے گلے میں باندھ دیئے۔ شیخ جی کا دم کیا ہوا پانی بوتل میں بھر لیا۔ مجیدن پیتی رہی۔ پانچ سال یہ سب کچھ کیا پھر بھی مجیدن کا جی نہیں متلایا۔

موسی نے مشورہ دیا کہ ایک باران کے کہنے سے شہر کی منجھی ہوئی نربدا بائی کو دکھا دے۔ پرانی دایہ ہے۔ نامی گرامی حکیموں کے نایاب نسخے گھول کے پی چکی ہے۔ کبیر اسے بھی بلا لایا۔ آدھے گھنٹہ تک مجیدن کو ٹٹولتی رہی اور باہر آ کے کبیر کو دوٹوک جواب دیدیا۔

''بھیا ان تلوں میں تیل نہیں۔ اولاد کا خیال دل سے نکال دو''!

کبیر پر مانو آسمان ٹوٹ کر آ گرا۔ آپے سے باہر ہو گیا۔ مجیدن کے گلے سے تعویز کھینچا، پانی کی بوتل اٹھائی اور سیدھا تالاب کے کنارے پہونچا۔ بابا جلال شاہ کی درگاہ کی طرف پیٹھ کی اور تعویز بوتل پانی میں پھینک دی۔ مایوسی میں ڈوبا وہیں چٹان پر بیٹھ گیا۔ گھنٹہ بھر دھوپ میں تپ چکا تو اُٹھنے کا ارادہ کیا۔ تبھی نارائن اسے ڈھونڈتا وہاں آیا۔

''کتنی دیر سے تمھیں تلاش کر رہا ہوں۔ یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ آج منڈی بھی نہیں آئے؟''

''مت پوچھ یار۔ اب تو زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا۔!

''مجھے تمھاری تکلیف کا اندازہ ہے۔ تم اپنی میڈیکل جانچ کیوں نہیں کرا لیتے۔ کوئی کھوٹ ہوگا پتہ چل جائے گا''

''کچھ نہیں ہونا۔ نربدا بائی نے بتا دیا مجیدن بانجھ ہے!

نارائن بھونچکا رہ گیا۔ وہ کبیر سے سگے بھائی جیسا تعلق رکھتا تھا۔ نربدا بائی کا خاندان صدیوں سے دور دور مشہور تھا اور یہ کہا جاتا ہے کہ اسے دیوی کا وردان ہے۔ وہ دونوں دیر شام تک افسردگی کے ماحول میں اسی بکھیڑے پر باتیں کرتے رہے۔ نارائن

ابھی تک کنوارہ تھا۔ چودھری نے وصیت کی تھی کہ جب تک چھوٹی بہنوں کی شادی نہیں ہو جائے وہ اپنے بیاہ کا تصور بھی نہیں کریگا۔ اٹھتے اُٹھتے اس نے کبیر کو دوسری شادی کا بھی مشورہ دیا مگر کبیر نے ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے نکال دیا اور صاف کہہ دیا کہ مجیدن اس کی جان ہے۔ اس کی سوتن لانا خود کی موت بلانا ہے۔

اپنی دلی خواہش پوری نہ ہونے سے مجیدن نڈھال ہوگئی۔ اسے اپنی قاتلانہ اداؤں پر پورا بھروسہ تھا۔ مگر آج اپنی ناکامی دیکھ اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ دل بیٹھ گیا۔ کبیر کی گالیاں اس کے سڈول جسم اور کساوٹ پر کیچڑ کی طرح چپک گئیں وہ خود کو چرخی میں پسے ہوئے گنّے جیسا محسوس کر رہی تھی جس کا سارا رس نچوڑ کے پھینک دیا جاتا ہے۔ مجیدن نے باہر کے دروازہ میں تالا ڈالا اور نارائن کے گھر پہونچ گئی تاکہ موسی کے سامنے دل کی بھڑاس نکال سکے۔ چھوٹے سے آنگن میں دو پلنگوں پر چار بنارسی ساڑھیاں، اور گوٹا کناری لگے کرتے، شلوار دوپٹے اور کئی جوڑے سجے رکھے تھے۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ فوراً پوچھ بیٹھی

''یہ کیا موسی؟ دوکان سجا رکھی ہے''!

''دھوپ دے رہی ہوں بیٹی۔ نارائن نے دونوں بہنوں کا سارا سامان اور دولھا کے جوڑے تیار کر رکھے ہین۔ بات پکی ہونے والی ہے''!

موسی پان کھانے دالان میں آئی اور مجیدن نے بھیگی آنکھیں پونچھتے ہوئے چھاتی میں دہکتی آگ اُگل دی۔ کبیر کی ضد بھی بیان کی کہ بلّی پالنے کی چھوٹی سی خواہش پوری نہیں کر پا رہا۔ نام لے دو بھڑک اُٹھتا ہے۔ ایک تو تنہائی کاٹنے کو اتارو دوسرے چوہے بوٹیاں نوچتے ہیں۔ اس نے گھگیاتے ہوئے موسی سے شیخ ضامن کے پاس جانے کی خوشامد کی۔ کبیر اُن کا مرید ہے وہ حکم دیدیں گے تو بلّی کی اجازت مل جائیگی۔ موسی نے تیس سال بیوگی کا دکھ جھیلا تھا۔ وہ جانتی تھی خالی گود بیاہتا کے لیے سانپ کی پٹاری ہوتی ہے۔ مجیدن کی باتیں سن دل پگھل گیا۔ کبیر پر غصہ بھی جتایا کہ چاندسی مجیدن کون سے

یاقوت جڑے کنگن مانگ رہی ہے۔ جھٹ تیار ہوگئی۔ سر پہ چادر اوڑھی اور مجیدن کو وہیں رکنے کا کہتی باہر نکل آئی۔ وہ پچاسیوں بار جنّات والی مسجد اور جلال شاہ کے مزار والی فٹ پاتھ سے گزری تھی۔ شیخ ضامن کے حجرہ کے پاس عورتوں کی قطار میں کھڑی ہوگئی۔ اس کی باری آئی۔ سر جھکائے جھجکتی شیخ ضامن کے تخت کے سامنے دوزانوں بیٹھ گئی۔

''کیوں کیا ماجرا ہے۔ جلدی کہد و''!

موسی نے مجیدن کی فریاد سنادی اور کبیر کو تاکید کرنے کی ہاتھ جوڑ کر درخواست کی۔ شیخ ضامن بھڑک اُٹھے۔

''وہ نامراد خود کیوں نہیں آئی؟ مجھے دلال پسند نہیں!'' موسی کانپ گئی۔ جلدی سے اٹھی اور الٹے پاؤں پلٹ پڑی۔ اس نے سن رکھا تھا اللہ والے نیک صوفی ریشم جیسے نرم ہوتے ہیں۔ آنکھوں میں نور، ہونٹوں پہ شبنم آواز میں اذان سی سحرانگیز کشش اور ہمدردی کی برف۔ لیکن شیخ ضامن کے ناگوار لہجہ نے اس کے ذہن میں خوف اور دہشت بھردی۔

منڈی میں نارائن کے ساتھ اُداس اُداس باتیں کبیر کو افسردہ کرگئیں تھیں۔ گھر جانے سے پہلے اس نے جلال شاہ کی درگاہ جانے کا من بنایا ادھر کئی مہینوں سے شیخ ضامن کے حجرے میں نہیں گیا تھا۔ جس دن اس نے تعویذ گنڈے تالاب میں ٹھنڈے کئے تب ارادہ کیا تھا کہ شیخ جی کے پاس کبھی نہیں جائے گا۔ خیال آیا کہ نربدا بائی کی بتائی منحوس بات ان تک بھی پہونچادے۔ شیخ ضامن تنہا بیٹھے تسبیح گھمار ہے تھے۔ کبیر کو دیکھ مسکرائے۔ وہ کمزور نحیف مریض کی طرح ان کے سامنے اُکڑوں بیٹھ گیا۔ شیخ ضامن دھیمے سے بولے۔

''گھر میں بلّی پال نامعقول۔ تیری ماں کی روح کو سکون ملے گا۔'' کبیر ان کا مشورہ سن کر گھبرا گیا کہ بلّی کہاں سے آ کودی۔

''حضرت۔ وہ بلّی۔ بلّی کے نام سے مجھے نفرت ہے۔ یہ گندی اور منحوس شئے دنیا میں کہاں سے آگئی۔

شیخ ضامن جب مراد آبادی برتنوں کے ایجنٹ تھے۔ ان کی کالی اور چھوٹی داڑھی تھی۔ خود دبلے پتلے اور گال پچکے ہوئے تھے۔ جس دن انھوں نے اسلام کو خطرہ سے باہر کھینچ لانے کا بیڑا اٹھایا۔ جنات والی مسجد اور جلال شاہ کے مزار کو اکیسویں صدی کی زیارت گاہ بنانے کے لیے سبز لبادہ پہنا تندرستی، شادابی اور تاجرانہ سمجھ بوجھ اُن کی غلام ہوگئی۔ وہ کھنکارے اور شاہانہ وقار اور عالمانہ نور چہرہ پر اجاگر کرتے کہتے گئے۔

''نامعقول سن لے کان کھول کر۔ وہ بتاتے گئے حضرت نوح کے وقت عذاب نازل ہوا تھا۔ وحی آئی کہ طوفان آئے گا۔ اللہ کے نبی نے سب کو بتایا۔ نیک بندے، جانور اور پرندے حضرت کی کشتی میں آبیٹھے۔ ایک رات سبھی نے شکایت کی کہ اے نبی۔ کشتی میں چوہے بہتات میں ہیں۔ اناج چٹ کر جاتے ہیں۔ حضرت نوح نے شیر کے سر پر ہاتھ پھیرا پلک جھپکتے ہی شیر کو چھینک آئی اور اس کے حلق سے بلی آگری۔ اس نے چوہوں کا صفایا کردیا''۔ نامعقول گانٹھ میں باندھ لے بلی بڑی برکت والی ہوتی ہے''

کبیر خاں غور سے یہ سب سنتا رہا۔ پل بھر کو سوچا کہ شیخ ضامن کے تعویز گنڈوں سے مجیدن کو چھینک تو دور کی بات ابکائی بھی نہیں آئی۔ تبھی شیخ ضامن بولے۔

''وہ تمھاری موسی آئی تھی۔ کہتی تھی کبیر کو تاکید کردوں کہ گھر میں بلّی لے آئے''!

یہ سنتے ہی کبیر کو ایسا لگا جیسے شیخ ضامن نے اس پر کھولتا گرم پانی انڈیل دیا۔ وہ تلملا گیا۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اُٹھا اور ناک بھوں چڑھائے واپس چل دیا۔ شیخ صاحب کی آواز پیچھا کرتی مدھم پڑگئی۔

''غصہ نہیں کبیر۔ غصہ حرام ہے''!

کبیر خاں کو مجیدن سے امید نہیں تھی کہ وہ شیخ ضامن کے پاس سفارش کے لیے موسی کو بھیجے گی۔ یہ کھلی نافرمانی اور سرکشی تھی۔ اس کا بھیجہ بھٹی بن گیا۔ وہ جانتا تھا مجیدن کے تیکھے نقوش، گوری چمڑی اور تھرکتی بوٹی نے اس کے دل و دماغ کو قابو میں رکھا تھا ورنہ وہ دوسری شادی بھی کرسکتا تھا۔ شاید اسی خود اعتمادی کی وجہ سے مجیدن نے موسی

کے درگاہ جاتے ہی اپنی بہن کے گھر سے بلی کا سفید بچہ منگوالیا تھا۔ وہ پلنگ پر اسے چھاتی سے لپٹائے تھپکیاں دے رہی تھی اور چہرہ پر حرص زدہ ممتا کے سائے جھلملا رہے تھے کہ کبیر خاں مرکھنے سانڈ سا ٹھوکر سے دروازہ کھول اندر داخل ہوا۔ مجیدن دہشت سے لرز اٹھی۔ سٹ گیا۔ کبیر خاں کا ایسا وحشیانہ انداز اس نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ جب بھی منڈی سے آتا۔ آہستہ سے دروازہ کی زنجیر بجاتا۔ پیار سے آواز دیتا۔

''جنن میں آ گیا'' مجیدن سب کام چھوڑ دیوانہ وار دروازہ کھولنے دوڑی آتی اور کبیر خاں کی چھاتی سے لگ جاتی۔ بلی دیکھتے ہی کبیر خاں کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ وہ گرج کر بولا۔

''جنن۔ اس منحوس کو کس کی اجازت سے لے آئی''؟ موسی کو درگاہ بھیجنے کی ہمت کہاں سے آئی؟''

مجیدن کے کاٹو تو لہو نہیں۔ آنسو ٹپکنے لگے۔ بلی کا بچہ میاؤں میاؤں چیخنے لگا۔ وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

''چوہوں نے جینا دوبھر کر دیا۔ یہ دیکھو پاؤں کا انگوٹھا نوچ لیا۔ صندوق کھولا تو شادی کے تینوں جوڑے جھر جھرے کر دئے''! مجیدن بلک بلک کر روتی گئی اور پھر کرتا اتارنے لگی۔ لیکن کبیر کی نگاہوں کا لاوا اُبلتا رہا۔ مجیدن کی چھاتی اس کی انا کا راستہ کاٹتی نظر آئی۔

''اللہ کی بندی۔ تجھے اپنے کپڑوں کی فکر ہے۔ نارائن کی بہنوں کی بنارسی ساڑھیوں اور شادی کے جوڑوں کا نہیں سوچا۔ ساٹھ سال پُرانا پڑوسی ہے نارائن کا پریوار۔ بلی لے آئی۔ اب چوہے بھاگ کے اس کے گھر میں جا بسیں گے۔''! پھر کبیر خاں نے عقاب جیسے بازو کھولے اور بلی کے بچے کو اٹھا کر پوری طاقت سے زمیں پر دے مارا۔ مجیدن کی تنہائی پر پُر ہول سناٹا چھاتا گیا۔

☆☆☆

قیامت کے دن۔۔۔!

میناکشی کی چودھویں سالگرہ ہمیشہ کی طرح آج بھی منائی جارہی تھی۔ نہ دھوم دھام نہ چیخ پکار اور نہ ہی مسکراہٹوں پر رقص کرتے غبارے اور ہیپی برتھ ڈے کی چہچہاتی آوازیں۔ ایسا سب کچھ آٹھ سال پہلے تک ضرور ہوا کرتا تھا۔ اکسائز انسپکٹر راجیش تیاگی اور اس کی پتنی سورن لتا اپنی بیٹی کی سالگرہ اتنی شان سے منایا کرتے تھے کہ محلے کا بچہ بچہ سال بھر بے چینی سے اس دن کا انتظار کرتا اور رنگ رنگ کی کریم اور چاکلیٹ پھول سے سجے کیک کے سپنے دیکھا کرتا۔ دو دن پہلے سے میناکشی نئے نویلے کپڑوں میں رحیم خاں کی انگلی تھام لیتی پھر دور دور ہر گھر میں جا گھستی اور سالگرہ میں آنے کے لیے اپنی سہیلیوں اور ان کے بھائی بہن کو دعوت دیتی۔

میناکشی گھٹے گھٹے بے رونق ماحول میں پیازی رنگ کی شلوار کُرتا پہنے اور سر پر دوپٹہ اوڑھے خاموش کھڑی تھی۔ دس بارہ بچّے ایک دوسرے کا منہ تکتے آئس کریم چوس رہے تھے۔ میناکشی بار بار دروازے کی طرف سر اٹھاتی اور پھر مایوسی سے سر جھکا لیتی اس کے کان رحیم خاں کی رس گھولتی آوازیں سننے کو بے چین تھے۔ وہی جادوئی آواز جو بچپن سے اس کے سارے جسم میں سپیرے کی بین جیسی سماتی آئی تھی۔ جسے سنتے ہی وہ تڑپ اٹھتی اور اچھلتی کودتی ادھر کو دوڑ جاتی۔

''میناکشی بٹی!

''کہاں ہو رانی!!

اسے ہی نہیں سب کو انتظار تھا محکمہ آبکاری کے معمولی سپاہی رحیم خاں کا جو مینا کشی کے ہاتھ میں چھری تھماتا اور کلائی پکڑ کر کیک کاٹ دیتا۔

''پاپا کو دو بیٹی!'' ہاں۔اب ممی کو! مینا کشی ٹٹولتے ہوئے کیک کا ٹکڑا اٹھاتی اور جھٹ سے رحیم خاں کے منہ میں ڈال دیتی جو پھسل کر داڑھی میں الجھ جاتا مدھومکھیوں جیسا۔''لو وہ آ گئے!'' راجیش تیاگی نے اتنا ہی کہا تھا کہ صغیرہ بی نے برقعہ کا اوپری حصہ اتارا اور لپکتی ہوئی مینا کشی کے پاس جا پہنچی چٹ پٹ بلائیں لیں۔اس کے لال مسوڑھے اور پیلے دانت کھل اٹھے۔

''جنم دن مبارک ہو بیٹی!''

رحیم خاں اپنے محکمہ میں راجیش تیاگی کی کامیابیوں کا ذمہ دار تھا۔ ناجائز شراب کا کاروبار کرنے والے خطرناک بدمعاش اور ان کے سرغنہ فلائنگ اسکواڈ کی جیپ دیکھتے تو یوں مسکراتے جیسے اسکولی اسکاوٹ آ رہے ہوں۔ گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ کا احساس بھی نہیں ہوتا لیکن پچھلی سیٹ پر رحیم خاں کا چہرہ نظر آتا تو افراتفری مچ جاتی۔ان کے ہوش اڑ جاتے اور سارا ساز و سامان چھوڑ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے۔چھتیس انچ چوڑا سینہ، گینڈے سی موٹی گردن، کلائیوں میں فولاد بھرا ہوا اور کرخت چہرے پر بڑی بڑی آنکھوں میں زمین کی چھاتی میں دبے دفینے تلاش کرنے کی طاقت تھی۔ پیشانی اور بھوؤں کے درمیان نماز کا سیاہ نشان ایک چھوٹے گرم تپتے توے کی طرح جو گرمی کے پسینہ میں بھیگتا تو، بوندیں پھلجھڑی سی بھڑکا دیتیں۔رحیم خاں کے ڈیل ڈول نے اتنا اثر دکھایا کہ سال بھر میں کالے دھندے والے شہر کی اندھیری گلیاں اور مکان چھوڑ سارا سامان لیکر دور دراز کے جنگلوں میں بھٹی جلانے لگے۔جب کبھی مخبری ہوتی، کھوج بین شروع ہو جاتی جنگل کے کسی درخت کے نیچے راجیش تیاگی جیپ رکواتا۔رحیم خاں سیٹ پر کھڑا ہو جاتا دور اٹھتے دھوئیں کی لکیریں دیکھتا اور زور زور سے سانس کھینچتا۔ پولس کے کھوجی کتے سونگھ سونگھ دم ہلاتے ناکام

لوٹ آئیں مگر راجیش تیا گی کو رحیم خاں پر پورا بھروسہ ہوتا۔ چند منٹ بعد رحیم خاں کی پیشانی کا قطب نما چمک اٹھتا اور وہ بائیں طرف پگڈنڈی پر گاڑی بڑھانے کا اشارہ کر دیتا سپاہی لاٹھیوں کو مضبوطی سے پکڑ لیتے اور تھوڑی دیر بعد ہی فلائنگ اسکواڈ ہکا بکا بدمعاشوں کو دبوچ لیتا۔

سورن لتا شاید پہلے ہی سے غصہ میں بھری کھڑی تھی۔ سناتن آشرم کے سوامی کل سے دوبار وہاں آئے تھے اور سورن لتا کے کانوں میں اُپدیشوں کا سنکھ پھونک چکے تھے۔ میناکشی کا کیک کاٹنے سے پہلے وہ اپنے دل کا کوئی بوجھ اتار دینا چاہتی تھی۔

''رحیم خاں۔ تمھارا تیاگ اور ارادہ سر آنکھوں پر لیکن ہمارے دھرم گرو۔ اس کی اجازت نہیں دیتے''

چھوٹے بڑے سب حیران رہ گئے کہ یہ نیا تماشہ کہاں شروع ہو گیا۔ راجیش تیا گی بھی گھبرا گیا اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ جلدی سے پانی کا گلاس اٹھایا اور حلق کے نیچے اتار گیا۔ سورن لتا تیوریاں چڑھائے بولتی گئی۔

''تم نے جو کچھ سوچ کر کمشنر کو فارم بھر کے دیا ہے وہ تُرنت واپس لے لو اور پرزے پرزے کر دو!''

راجیش تیا گی کو غصہ آ گیا۔

''کیا بک بک لگا رکھی ہے!''

''میں آپ کو بعد میں بتا دوں گی۔ رحیم خاں'' ''ہم دھرم وِرُدھ کوئی کام نہیں کریں گے''

صغیرہ بی سر جھکائے خاموش کھڑی رہی اور راجیش تیا گی پس و پیش میں یہ سب سنتا رہا۔ پھر رحیم خاں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''چلو رحیم خاں۔ اپنا کام شروع کرو!

'نہیں جی۔ پہلے ان سے ہاں کہلواؤ۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے''

''سچ کہا بی بی جی اب بھی نہ مانے تو اللہ قسم قیامت کے دن ان کا دامن پکڑونگی''!

صغیرہ بی کے بھی آنسو چھلک پڑے۔ میناکشی نے اتنا سنا اور گھبرا کے رحیم خاں کی طرف دونوں ہاتھ بڑھائے۔

''چاچا۔کیا قیامت آرہی ہے'' رحیم خاں تڑپ اٹھا۔محبت سے میناکشی کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

''نہیں بیٹانہیں۔وہ اب نہیں آئیگی۔چلو کیک کاٹ دو۔''

یونین کاربائڈ کا نام دیش میں کسی نے کبھی سنا بھی نہیں تھا لیکن یونین جیک کو پورا ملک جانتا تھا۔ڈیڑھ سال تک دہلی کے لال قلعے کی فصیلوں پر لہرایا اور جب ہزاروں لاکھوں سرفروشوں کی قربانی لیکر اترا ملک کوٹکڑے ٹکڑے کرلہولہان کر گیا۔یونین کاربائڈ نے بھوپال میں قہر برسایا اور دوتین دسمبر ۱۹۸۴ء کی رات جب برفیلی ہواؤں نے کشمیر اور شملہ سے اپنا رُخ میدانی علاقوں کی طرف۔ کیاتو زندگیاں لحافوں میں ٹھٹھر کر رہ گئیں۔اس وقت اِس کیڑے ماردوائیں بنانے والے کارخانے کے زمیں دوز فولادی ٹینکرس نے اندھیرے میں زہریلی گیس اگلنی شروع کی تھی۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں میں موت گھلتی گئی۔آہستہ آہستہ زمین پر رینگتی دھوئیں کی لکیریں ناگن جیسی پھن اٹھائے بڑھتی گئی۔نہ سرسراہٹ نہ کوئی آواز۔بند کھڑکی دروازے اسے روک نہ پائے۔سانسوں میں سمائی اور دل کی دھڑکنیں رکتی گئیں۔لوگ بیدار ہونے لگے۔جھلمل تاریکی میں انجانے راستوں پر دوڑ پڑے۔ہاتھ سے ہاتھ چھوٹ گئے۔انسانی حوصلوں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔اچھے اچھوں کے قدم اکھڑ گئے۔نہ کوئی مونس نہ مہرباں۔موت ناکردہ گناہوں کو اپنی لپیٹ میں لیتی آدم خور شیر کی طرح پیچھا کر رہی تھی۔اس رات کتّوں کو نہ جانے کیا ہوگیا تھا۔غول کے غول دن رات ایک دوسرے کو بھنبھوڑتے پھرتے تھے۔آج سب کی غرّاہٹ غائب تھی۔شاید انھیں سانپ سونگھ گیا تھا۔

دو دن کی نفسا نفسی کی بعد لوگ ہوش میں آئے۔ آدم وحوا کو اپنی جنت کی یاد آئی لوگ اپنے ویران گھروں کو تھکے ماندے لوٹنے لگے۔ ان لشکریوں کی طرح جو جنگ میں شکست کھائے اور زخموں سے، چور اپنی پناہ گاہوں کی طرف آتے ہیں۔ ہزاروں ہزار انسان موت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ لاکھوں آج تک بیماریوں سے سنگھرش کر رہے ہیں۔ رحیم خاں کی دو بیٹیاں تھیں دونوں بھگدڑ میں کچل گئیں۔ تین دن بعد صغیرا بی نے لاشیں شناخت کیں، سر کے بال نوچ ڈالے اور چھاتی پیٹ پیٹ پسلیاں توڑ لیں۔

راجیش تیاگی نے دروازہ کا تالا کھولا اور سورن لتا نے میناکشی کا ہاتھ پکڑے اندر پاؤں رکھا ہی تھا کہ میناکشی چوکھٹ سے الجھ کر لڑکھڑائی اور اوندھے منہ فرش پر گر پڑی۔ سورن لتا جھپٹی تو میناکشی چیخ پڑی۔

''ممی۔ پاپا۔ میری آنکھیں۔ ہائے رام۔ مجھے کچھ بھی نہیں دکھائی دے رہا!''

راجیش تیاگی اور سورن لتا کے ہاتھ پاؤں مفلوج سے ہو گئے۔ بڑی مشکل سے انھوں نے میناکشی کو اٹھایا۔ راجیش اسے گود میں لے کر سڑک پر آ گیا۔ آٹو روکا اور تینوں بڑے ہاسپٹل کے لیے روانہ ہو گئے۔ میناکشی ہاتھوں سے آنکھوں کو مسل رہی تھی اور اس کی ہر سسکی سورن لتا کے کلیجے میں برچھی جیسی چبھتی گئی۔ ہاسپٹل کے وارڈ کراہتے، بلکتے اور تڑپتے مریضوں سے اٹے پڑے تھے۔ کیا چھوٹے کیا بڑے۔ چہروں پر سوگواری اور آنکھیں اشکبار۔ دو دو مریض ایک ہی بیڈ پر لال کمبلوں میں بیر بہوٹی جیسی گٹھری بنے پڑے تھے۔ ہر ایک کی زبان پر ''ہائے رام۔ ہائے اللہ''۔ تیماردار جان پہچان والے کو دیکھتے ہی بول اٹھتے۔

''قیامت تھی بھائی۔ ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔ ایسا پہلے کبھی نہ دیکھا نہ سنا''

چھ مہینے میناکشی کی آنکھوں کی جانچ ہوتی رہی۔ نت نئے آئی ڈراپ آزمائے گئے۔ ماہر سے ماہر ڈاکٹروں نے اپنے تجربوں کا نچوڑ انڈیل دیا مگر میناکشی کو گنگنانے گدگدانے اور جھلملانے کی منزل تک پہونچانے میں ناکام رہے۔ وہ اپنی آواز تو سن

رہی تھی لیکن ماں اور باپ کے چھلکتے آنسو نہیں دیکھ سکی ۔ راجیش تیا گی کا افسری شان سے پھولا ہوا سینہ نڈھال ہوگیا۔ کلف دار یونیفارم کی شرٹ پر پیتل کے چمکتے اسٹار ماند پڑ گئے ۔ دن گزرتے گئے ۔ بمبئی ،کلکتہ مدراس اور دہلی کے ڈاکٹر بھی تھک ہار گئے ۔ آنکھیں تو بہت سوں کی گئیں لیکن وہ اس قابل نہ تھے کہ شہر کے ہاسپٹل کے علاوہ کہیں اور جاسکیں ۔ راجیش تیا گی نے شرڈی اور اجمیر کی بھی خاک چھانی ۔کوئی چمتکار نہیں ہوا۔ تقدیر کے آگے تدبیر نے بھی گھٹنے ٹیک دیئے۔ ادھر میناکشی کا بچپن کلکاریاں بھولتا نوجوانی کی چوکھٹ پار کرگیا۔ دفتر کے لوگ باگ ، رشتہ دار، دوست صلاح مشورہ دینے میں پیچھے نہیں رہے اور دور کی کوڑیاں بھی لائے ۔

''اخباروں میں اشتہار نکالو۔ایک ارب کی آبادی میں کوئی تیا گی مل ہی جائے گا!

''ہاں ۔منہ مانگے پیسے دیدیں گے!''

''بیسیوں لاوارث لاشیں آتی ہیں پوسٹ مارٹم کے لیے۔ٹائم پر اسٹاف کو نوٹ دکھادو!

''بیکار کی باتیں ہیں۔گردے بیچنے والے مل جاتے ہیں۔خزانہ کا منہ کھول دو اور ایک آنکھ بھی لے کر دِکھادو!

''ایشور قسم بالکل ٹھیک کہا۔سورن لتا بھابی تو ماں ہے۔اس سے پوچھ لو۔وہ دیگی ایک آنکھ''؟

''ہاں جی ۔دنیا میں آنکھ سے قیمتی کوئی چیز نہیں''

میناکشی کا حادثہ ہوا تب ہی راجیش تیا گی نے رحیم خاں کی ڈیوٹی اپنے بنگلہ پر لگوائی تھی ۔ رحیم میناکشی کے ساتھ دن بھر رہتا ہے شام کو پارکوں کی سیر کراتا۔ میناکشی خوشبو سونگھ کے پھولوں کے نام بتا دیتی کبھی تالاب کے کنارے بیٹھ جاتے ۔Zoo میں گھومتے جہاں رحیم خاں ہرسمت میناکشی کا سر موڑ کر جانوروں کی پہچان کراتا۔ وہ شیر، ادھر ہرن، سانبھر، نیل گائے اور چکارے ہیں۔ وہاں چیتا، تیندوا اور بھالو ہیں۔

نومبر مہینہ کا آخری دن تھا۔ دفتر میں رحیم خاں کی الوداعی پارٹی ہوئی۔ ہاروں سے اس کی گردن اور چھاتی جھک گئی۔ دلہن کی بدائی کی رات اور سرکاری ملازم کی پینشن کی شام دفتری نظام کا یادگار لمحہ بن جاتی ہے۔ خوشی اور غم کی بے آواز سسکیاں آنے والی زندگی کے البم میں قید ہو کر وقت کے تھپیڑوں کی مار سے دھندلی ہو جاتی ہیں۔ اُسے احساس ہوا کہ ۴۴ سال کا طویل عرصہ اتنی جلدی گرد و غبار اڑاتا گزر گیا۔ نوکر ہوا تب صرف تیس روپے تنخواہ ملتی تھی۔ روپیہ میں بڑی طاقت تھی۔ ماں بیوگی میں دل کھول کر مسکرائی۔ سال بھر بعد شادی بھی ہو گئی۔ اطمینان سے زندگی بسر ہوتی گئی۔ ماں کی موت ہوئی تو تنخواہ پانچ انکریمنٹ جُڑ کر چالیس روپے ملنے لگی۔ دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ تب مہنگائی نے پاؤں پسیرے۔ سرکار نے بھتہ بڑھا دیا۔ کل پاؤتی ستر روپے ہوئی۔ آب کاری محکمہ میں افسر سے لیکر چپراسی سب پر ہُن برستا تھا۔ مگر اُس نے شراب کی طرح اوپر کی کمائی کو بھی حرام سمجھا۔ شاید اسی لیے اُس کی ایمانداری کی محکمہ میں سب قسم کھاتے تھے۔

سرکاری جیپ سے پھولوں کی خوشبو میں نہایا رحیم خاں گھر کے دروازہ پر اُترا تو پلاسٹک کے فائل کور میں پینشن آرڈر، فنڈ اور گریچویٹی کا چیک سینہ سے لگا لیا اور ہاتھ جوڑتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو رخصت کیا۔ صغیرہ بی پردہ کی آڑ سے یہ تماشہ دیکھتی رہی۔ وہ سمجھ رہی تھی تنخواہ کے لفافہ کی طرح رحیم کی خاں چوالیس سال کی خدمات کے صلہ میں نوٹوں کی گڈیوں سے بھری صندوقچی اس کے ہاتھوں میں تھما دیگا۔ لیکن کاغذ اور سفید نیلگوں چیک دیکھ کر وہ ٹپٹا گئی۔

''یہ کیا اُٹھا لائے؟ تُم تو کہہ رہے تھے دو لاکھ روپیہ ملیگا''!۔۔۔ رحیم خاں نے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیری اور سمجھایا کہ کاغذ کا چیک نوٹوں کی نقاب ہوتا ہے۔ اسے چھپا کے رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ خون پسینہ کی کمائی کا قیمتی تمغہ ہے۔ بینک میں جا کر رکھ دو اور آخری سانس تک نوٹ نکالتے رہو۔ دونوں کے لیے وہ رات جاگنے

کے لیے تھی۔ سہاگ رات جیسی سہانی اور یادوں کے عطر میں مہکتی۔ گھنٹے بھر کی باتوں کے بعد رحیم خاں نے فیصلہ سنا دیا کہ اب حج کرنے جائیں گے۔ صغیرہ بی کی رگوں میں جیسے خوشی کی موجیں مچلنے لگیں۔ وہ بڑے چاؤ سے رحیم خاں کے پاؤں دبانے لگی۔ چار بجے رحیم خاں نے اُسے بتایا کہ میں نے سبزی مارکٹ میں دو کمروں کا مکان کرایہ پر لے لیا ہے سامان لیکر ہفتہ بھر میں وہاں جا بسیں گے۔ پھر آہستہ سے کہا۔ ''اب حج کی تیاری میں لگ جاؤ۔۔ ایک بات اور کان کھول کر سُن لو صغیرہ موت کے بعد میری دونوں آنکھیں سرکاری ڈاکٹر نکال لیں گے۔ میں نے آج ہی خیرات کر دی۔ ہیں''!

صغیرہ بی کے کانوں میں گرم گرم سیسہ آ گرا سر سے پاؤں تک خون جم سا گیا۔ دل اچھلنے لگا۔ کنپٹی کی رگیں کھینچنے لگیں۔ وہ کانپتی آواز میں بولی۔

''اب آخری عمر میں سٹھیا گئے۔ دیوانے ہو گئے۔ یہ کون سی دُھن سوار ہو گئی''!

وہ تلملاتی گئی۔ زبان پر کونین کی کڑوی پرتیں چڑھتی گئیں جو منہ میں آیا بکنے سے نہیں تھکی۔ اللہ نے مومن کو ماں کے پیٹ سے جیسا پیدا کیا ویسا ہی اسے واپس لوٹنا ہوتا ہے۔ ٹوٹے گھنگرو اور پھوٹی آنکھ کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ رحیم خاں خاموشی سے سنتا رہا۔ بس اتنا ہی کہا کہ اس کی مردہ آنکھیں کسی اندھے کو روشنی دیدیں یہ حج سے کم نہیں۔ دیکھ لینا اللہ ہمارے حج کو قبول کریگا۔ صبح ہو رہی تھی۔ اذان کی آواز سنتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مسجد جانے کے لیے جانے کو تیار ہوا اور بولا'' آج میناکشی بیٹی کی سالگرہ ہے۔ سب تیاری کر لینا۔

ایک سال بیت گیا ۳۰ نومبر کو حج کے لیے روانہ ہونے کے لیے رحیم خاں اور صغرہ بی کو بمبئی جانا تھا۔ محلّے کے افراد کے علاوہ رمیش تیاگی، سورن لتا اور میناکشی نے انھیں ہفتہ بھر پہلے گلدستے پیش کئے تھے۔ رحیم خاں نے میناکشی کو جی بھر کے چوما اور کہنے لگا

''میں مدینے والے کے روضہ پر دعا کروں گا کہ بیٹی تمھیں دنیا کے دیدار کرنے کی شکتی ملے گی۔''

دوسرے دن وہ اسٹیشن پر ریز رویشن پوزیشن دیکھنے گھر سے نکلا۔

نفرت کی بھٹی، غصہ کا لوبان اور انتقام کی چنگاریاں ناجائز شراب کا دھندہ کرنے والوں کے دل میں آگ لگا چکی تھیں۔ دو گروہ آپس میں گتھم گتھا ہوگئے۔ بلم گنڈاسے اور تلواروں نے خوب جوہر دکھائے۔ چار دن پہلے پولس اور اکسائز کے فلائنگ اسکواڈ نے مل کر چھاپہ مارا تھا اور لاکھوں کی زہریلی شراب ضبط کی تھی۔ یہ محض بہانہ تھا کہ رحیم خاں کی مخبری نے گل کھِلایا ہے۔ یہ پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ عید کا چاند دیکھنے والی بوڑھی آنکھوں کو دیوالی کے چراغ دیکھنے کا سہارا نہیں بننے دیا جائے گا۔

''سالا۔ کتا۔ گِدھ کی اولاد تا کتا تاڑتا ہے اور کتّے جیسا سونگھتا بھی ہے''

''پینشن ہوگئی، گھر بیٹھا رہتا۔ تجھے اب کیا لینا دینا!

''راجیش تیاگی کا چمچہ۔ اس کی اندھی بیٹی کو آنکھیں دان کرے گا پاکھنڈی''!

''ہمارا دھرم بھرشٹ کرے گا''

رحیم خاں کی خون میں لت پت لاش دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ آنکھوں کے گہرے سوراخوں میں خون جم گیا تھا۔ صغیرہ سانس روکے پاسپورٹ میں چسپاں رحیم خاں کے فوٹو کی گمشدہ آنکھوں کو ڈھونڈتی رہی اور میناکشی کی بےنور آنکھوں سے آبشار بہہ نکلا۔ وہ سِسکتی آواز میں آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔

''رحیم چاچا۔ قیامت کے دن تمھارا دامن پکڑوں گی!''

☆☆☆

بجو کا شکر گنجی

''صدا فقیر کی!

''فرید شکر گنج۔ نہ رہے دُکھ نہ رہے رنج''!

''کیا تھا کیا ہو گیا۔ چمن تھا گلِ ہو گیا''!

''یا درب کی اور خیر سب کی''!

''یہاں لے اور وہاں دے''!

''تیرے آگے کی بھی خیر۔ پیچھے کی بھی خیر''!

''اِس ہاتھ دے۔ اُس ہاتھ لے''

''دھم قلندر، دودھ ملیدا''!

''مست قلندر، دودھ ملیدا''!

کاندھوں تک اُلجھے بکھرے سفید بال جیسے کباڑی کی دوکان کے کونے میں دھول سے اٹا باریک تار کا گچھا۔ ہاتھ لگائیں تو انگلیوں پر خون کی بوندیں چھلک اٹھیں۔ ناف سے اوپر سینہ کو چھوتی لمبی داڑھی۔ ایسی ویران اُجاڑ جھاڑی دکھائی دیتی جہاں مکڑیاں بھی جالا بننے سے کترائیں۔ سانولا رنگ، پستہ قد اور منمناتی کمزور آواز۔ موٹے ہونٹ، گھٹنوں سے پاؤں تک سیاہ کُرتا اور اُسی رنگ کی تہمد۔ جوہری بازار سے صدر ہاسپٹل کی لانبی سڑک پر وہ صبح سے شام تک یونہی آواز لگاتا گھومتا رہتا۔

''دھم قلندر۔ دودھ ملیدا''!

''مست قلندر۔ دودھ ملیدا''! نہ ہاتھ میں کٹورا نہ بغل میں تھیلا اور نہ کسی کے آگے بھیک مانگنے کو اس کی ہتھیلی کھلتی۔ جوہری بازار میں جب کبھی بنیوں کی چھوٹی بڑی دوکانوں میں گاؤں کے کسان ان کی دُبلی اور اُجڑی صورتوں والی عورتیں چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں بازو میں دابے داخل ہوتیں تو وہ درد میں ڈوبی آواز میں چیختا۔''

''تیرے آگے کی بھی خیر۔ پیچھے کی بھی خیر''!

گود میں بے جان سے بچّے کو سمیٹے بلکتی روتی ماں ہاسپٹل میں بھاگتی ہوئی ڈاکٹر کے کمرہ میں پہونچتی تب بھی وہ اسی طرح صدا لگاتا۔

''یا رب کی اور خیر سب کی''! وہ بے چینی کی حالت میں بڑے دروازہ پر سر تھامے بیٹھ جاتا۔ تبھی اندر سے اسٹریچر پر سفید چادر میں کسی لاش کو ڈھانپے باہر لایا جاتا تو وہ سر جھکائے دھیمی آواز میں بولتا۔

''کیا تھا کیا ہوگا۔ چمن تھا گلِ ہوگیا''!

گرمی ہو بارش یا سردی۔ اس کی چال ڈھال اور آواز پر کسی بھی موسم کا اثر نہیں پڑتا۔ موسلا دھار بارش اور بجلی کے کی کڑکڑاہٹ سنتے ہی کسی دوکان کے سائبان تلے بیٹھتا تو مینڈکوں کی بولتی بند ہوجاتی۔ برفیلی سردی میں حکیم ہوٹل کی بھٹّی کے پاس جا لیٹتا اور جلی ہوئی روٹی کی سگندھ سے بھٹکی بھوک کو تسلّی دے لیتا۔ سورج کی آگ برساتی گرمی میں تالاب کے کنارے پیپل کے پیڑ تلے سکون سے خراٹے بھرتا۔ ڈیل ڈول چہرہ کی جھرّیوں اور حلق کے نیچے لٹکی کھال سے اندازاً اس کی عمر ۷۰ سال سے کم نہ ہوگی۔ شہر کے لوگ اسے بابا کہا کرتے تھے۔

میں نے دسویں کا امتحان پاس کیا تو ماں نے چار سوتی شرٹ اور دو پینٹ جو بیتے دسہرے میں سلوائے تھے، کپڑے کے تھیلے میں رکھدئے۔ پچاس روپیہ کا ایک نوٹ، ڈھیر ساری دعائیں اور چٹاچٹ گالوں، پیشانی پر پیار کیا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں روزگار کی تلاش کا چٹان جیسا بوجھ اٹھائے ودھوا ماں کے مچلتے ارمان پورا کرنے

کے لئے گوالیار اپنے ماما کے پاس آ گیا۔ ایشوران جیسا ماما سب کو دے جتنا پیار اپنے بچوں کو دیتے اتنا ہی مجھے دیتے۔ ماں اور وہ نانا نانی کی دو ہی اولاد بچے تھے۔ وہ ضلع پولس آفس میں اپر ڈویزن کلرک تھے اور دو کمروں کے سرکاری مکان میں رہتے تھے۔ ماما نے سب سے پہلے روزگار کاریالیہ میں میرا نام درج کرایا اور کئی نجی کمپنیوں میں درخواستیں لگوادیں۔ تین مہینے دن بھر پیدل چلتے چلتے چمڑے کی چپلیں سارا رنگ روغن کھو بیٹھیں۔ پیڈلیاں درد سے بلکنے لگیں۔ گاؤں کی پگڈنڈیوں نے تار کول کی سڑکوں سے ناطہ کیا جوڑا گائے بھینسوں کے تازہ شدھ دودھ سے پیدا خون شرما گیا۔ ایک دن دل گھبرایا، ماں کی تھپکیاں اور دلار یاد آیا تو گھومتا ہوا تالاب کے کنارے چلا آیا۔ پیپل کے تنے سے کمر ٹکائی اور آنکھیں موند لیں۔ اسی حالت میں رات کے نو بج گئے۔ اچانک کڑکتی آواز سے نیند ہوا ہو گئی۔

''فرید شکر گنج۔ نہ رہے دکھ نہ رہے رنج''!

میں ہڑ بڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ تاریکی میں شہر کے روشن قمقمے تاروں جیسے چمک رہے تھے۔ سناٹے میں جھینگروں کے بولنے کے سلسلے کو بابا کی ڈراؤنی قد و قامت اور بھاری قدموں کی چاپ نے توڑ دیا۔ میرا تھکا ماندہ جسم خوف سے لرز اٹھا۔ دس قدم دور کھڑے بابا کی اندھیرے میں چمکتی آنکھیں میری ہمت کو پسینہ میں تر کر رہی تھیں۔ میں نے چاہا کہ دوڑ لگادوں، لیکن زمین نے دونوں پاؤں جکڑ لئے۔ تبھی آگے پیچھے دو کاریں ادھر کو آئیں۔ تیز ہیڈ لائٹس نے تاریکی کی چلمن اُتار پھینکی۔ بابا مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے چہرہ پر نرمی کے آثار نظر آئے تو میری خوفزدگی کا پارہ بھی بکھر گیا۔ لاکھوں کی آبادی میں شاید میں ہی پہلا انسان تھا جسے اس نے مخاطب کیا۔ ہمدردی سے شرابور تھے اس کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ۔

''چیل کے گھونسلہ میں گوشت کی بوٹی ڈھونڈنے نکلے ہو۔ مگر لڑکے ابھی اللہ کا حکم نہیں ہوا ہے۔!''

میں اس کا دھرم پہچان گیا مگر اس کے وشواس کی شکتی نے میری نا اُمیدی بڑھادی۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ بابا کیسے جان گیا کہ بیروزگاری کے تھپیڑوں نے میرے حوصلوں کے چھیتڑے اڑادئے ہیں۔

''بابا میری مدد کرو۔ گاؤں میں ماں میرے کارن روتی ہے۔''!

کاریں کب کی گزر چکی تھیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی موجودگی کا صرف احساس ہی کر پا رہے تھے۔

''ساری دنیا کی مائیں روتی رہتی ہیں۔ ان کی تقدیر بارش کے موسم میں لکھی گئی ہے۔ میرے بیٹے کی ماں بھی چلاّئی اور گڑگڑائی تھی۔ سنتا کون ہے۔؟''

یونس کے پاس دو راجستھانی بیلوں کی جوڑی تھی۔ پانچ ایکڑ زمین ہانکنے اور جوتنے کو کافی تھی۔ وہ سوچتا تھا ایک جوڑی اور مل جائے تو اناج منڈی لے جانے کا خرچ بچ جائے۔ دوسروں کا مال ڈھونے سے آمدنی بھی بڑھ جائے گی۔

سرپنچ کے ٹریکٹرٹرالی سے منڈی تک کا بہت زیادہ بھاڑا تھا۔ تین سال سے مانسون کی چاہ میں کئی ضلعوں کے کسان جمع پونجی کھا چکے تھے۔ بُھکمری اور اکال نے ساہوکار کی ہتھیلیوں کی کھجلی کافور کردی۔ کبھی کبھی کالی بدلیاں آسماں کو ڈھانکتیں۔ کسان دوڑے دوڑے کھیتوں میں آتے۔ فضا میں نمی گھل جاتی۔ لیکن طوفانی ہوائیں پل بھر میں بدلیاں اڑا لے جاتیں اور سورج امیدوں کو منہ چڑاتا آگ برسانے پھر نکل آتا۔ سب کی کھوکھلی چھاتیاں دل کی دھڑکنوں سے کِھلواڑ کرنے لگتیں۔ کتنے تہوار آئے اور سانپ جیسے لہراتے بل کھاتے گزر گئے۔

اب کی برس بادل اتنے ٹوٹ کر برسے کہ تال تلیاں ابلنے لگیں۔ کنوئیں منڈیریں توڑنے لگے۔ گاؤں سے چار میل دور بہتی ندی نے کنارے بسے کئی گاؤں ہڑپ کر لئے۔ کسانوں کے سوکھے ہونٹ کِھل اٹھے، اور گھروں میں چھائی مُردنی

چھٹ گئی۔ بال بچوں والیوں نے ابھی سے سپنے میں ڈوبنا شروع کر دیا کہ اس برس بیٹیوں کی ڈولیاں اٹھ جائیں گی۔ یونس اور اس کی بیوی سکینہ کے سر سجدے میں گر گئے۔رات گئے بھیگی بھیگی ہواؤں کے شور میں وہ یونس سے بولی

''اللہ نے ہم لاچاروں کی سن لی۔ اب کی فصل کاٹ لو تو لڑکیوں کی بھی فکر کر لیں۔ کب تک پھٹے چیتھڑوں سے جوانی ڈھانپتی رہوں گی؟''

''جتنی فکر تجھے ہے اتنی مجھے بھی ہے۔ پر کیا کریں۔ کنوئیں کے لئے ساہوکار جی سے دس ہزار لئے ہوئے ہیں۔ تین سال سے ایک روپیہ ہی نہیں دیا۔ بھکاری کی طرح ہر سال مہلت لیتا ہوں۔ اس فصل پر تو ہر حال میں چکانا ہی پڑے گا۔''!

قرض تو بنک سے بھی مل جاتا۔مگر لکھا پڑھی اور انگوٹھے لگانے کے بعد بھی پوری رقم نہیں ملتی۔ بیچ کے دلالوں کو کمیشن اور بابوؤں کی جیب قدم قدم پر منہ پھاڑے رہتی ہے۔کسان گھبرا کر بنک کی سیڑھیاں اترتے اور سیدھے بالم پور تحصیل پہنچتے۔ ساہوکار کے سامنے کھتونی رکھی۔ لال رنگ کے بہی کھاتے میں انگوٹھا لگایا اور نوٹ گنتے گنتے تھوک سوکھتا دیکھ اٹھ کھڑے ہوتے۔ یونس چھوٹا کسان تھا۔ گھنے جنگلوں سے گھرے دور دراز کے چھوٹے گاؤں میں پانچ ایکڑ زمین کی اوقات کیا ہوتی ہے۔مٹی کے تیل سے جلتی چھوٹی سی بستی کی روشنی میں پڑوس کے جھونپڑے بھی دکھائی نہیں دیتے۔ چار طرف دیواریں اینٹ گارے سے بنالیں اور چھت پر کویلو چھادئے تھے۔مشکل سے ۲۰ فیٹ کی جگہ میں یونس اپنی بیوی، بچوں کے ساتھ دھواں دھار بارش میں سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ پرانی کھپریل کی چھت دو تین جگہ سے ٹپک رہی تھی۔اس کی بیٹیوں نے دروازہ کا ٹاٹ اُتارا اور اپنے بھائی کے اوپر ڈال دیا۔دونوں دیوار کی اوٹ میں ایک

دوسرے سے لپٹ گئیں۔ کافی رات گزری اور بارش رُکی تو ہر طرف سے مینڈکوں کے ٹر ٹرانے کی گونج میں یونس اٹھ بیٹھا۔

''اللہ کی رحمت ہے سکینہ بی۔ اس بار قرضہ ادا کردینا ہی اچھا ہے۔ ہماری بھلائی اسی میں ہے۔ گئے سال ہی ساہوکار کے تیور اچھے نہ تھے۔ اب نہ جانے کیا کر بیٹھے۔''!

''ابھی تین مہینے باقی ہیں مکا جوار پکنے میں۔ کچھ نہ کچھ راستہ کھوج لیں گے''

سکینہ بی آہستہ سے بولی تاکہ بچوں کی نیند نہ ٹوٹ جائے۔ یونس کی سمجھ میں ترکیب آئی اور کہنے لگا۔

''ایسا کریں بشیرا کو شہر بھیج دیں۔ وہاں اچھی مزدوری مل جاتی ہے۔ فصل کٹنے تک دو ڈھائی ہزار کما لیگا۔''

''چھی چھی چھی۔ کیسا انیائے کرتے ہو۔ ابھی بارہ سال کا ہے میرا بشیرا۔ شہر پھر شہر ہوتا ہے۔ تمہارے گاؤں جیسا نہیں وہاں ریل گاڑی چلے ہے۔ موٹر اور پھٹ پھٹیاں۔ کیڑے مکوڑوں جیسے لوگ۔ بشیرا پل بھر سانس نہ لے سکے گا۔''!

''اری عقل کی دشمن۔ روپیہ پیسہ کے آگے نہ گاؤں نہ شہر۔ میری بات مان لے۔ لڑکیوں کے لئے سہارا ہو جائے گا۔!''

''نا نا بابا۔ کبھی نہیں۔ یہاں بھی تو وہ تمہارا ہاتھ بٹائے ہے۔ بیل جیسا دن بھر کھیت میں جُتا رہے۔''!

''میں کہتا ہوں اوس سے کہیں پیاس بجھے ہے۔''!

سکینہ بی کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ سر جھکائے روتی رہی۔ تھک ہار کے یونس خراٹے بھرنے لگا۔

یونس کے کھیت میں مکا جوار نے سر اٹھانا شروع کیا تھا کہ اُدھر گاؤں سے تیس میل دور رہنے والے ساہوکار کے بہی کھاتوں کا پیٹ پھولنے لگا۔ اس کی نگاہیں لہلہاتی فصلوں کو گدھ کی طرح تاکنے لگیں۔ ہر چھوٹے بڑے گاؤں میں اس کے مخبر تھے جو قرض داروں کی آتی جاتی سانس تک کی خبر ساہوکار کو پہونچاتے رہتے تھے۔ ویسے بھی اچھے مانسون کو دیکھتے ہی اس کے کان کسی چوکس چوہے جیسے کھڑے ہو جاتے۔ یونس کے کھیت کی مینڈھ پر بھی ساہوکار کے کارندوں کے بھاری قدموں کی چاپ پھنکارنے لگی۔ مٹی پر انکی لاٹھیوں کی دھمک پڑتی تو یونس کے گھر کی دیواروں پر بیٹھی چھپکلیاں ادھر ادھر دوڑنے لگتیں۔ یونس اور بشیرا خوف زدہ نظروں سے آسمان چھوتی مکا کی بالیوں کو تکتے رہتے جو ٹاٹ کے پردے جیسی سکینہ بی اور اس کی جوان بیٹیوں کی عزت و ناموس کی رکھوالی کا حوصلہ کر رہی تھیں۔ ساہوکار بھی بڑا ... گھاگ تھا۔ پرکھوں کے ریتی رواج نے اس کے مزاج اور بدھی میں وقت کی نزاکت اور سیاست کی پوتھیوں کا بیج بو دیا تھا۔ جو مانسون کے رحم و کرم سے نہیں بلکہ دماغ میں بکھری زرخیزی سے کسی بھی وقت پھوٹ پڑتا ہے۔ کھیتوں کو لٹھ بازوں سے گھیرنے اور کھلیانوں کو آگ لگانے کا زمانہ نہیں تھا۔ جیسے ہی اسے خبر ملی کہ یونس اناج بیچنے منڈی گیا ہے وہ چیتے کی رفتار سے گاؤں پہونچا اور یونس کے دروازہ کے باہر دو نوکروں کے ساتھ کرسی بچھا کر بیٹھ گیا۔

شام کے پانچ بجے کا وقت تھا۔ وہ کن انکھیوں سے ٹاٹ کے پردہ کے پار جھانکنے میں مصروف تھا۔ ٹاٹ میں اتنی تاب نہ تھی۔ بے شمار موسموں کی مار جھیل چکا تھا، کہاں تک ساہوکار کی بھیڑیے جیسی ہوسناک نگاہوں کی تپش روکتا۔ ہوا کے جھونکے پر دے کے چھوٹے چھوٹے چھیدوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے۔ ساہوکار نے یونس کی بیٹیوں کو جی بھر کے تاکا۔ گھورا، اور پھر کڑک دار آواز میں بولا۔

''اوئے بشیرے۔ کب آئے گا تیرا باپ''! ٹاٹ کا پردہ اس گرجدار گونج کو نہیں روک پایا اور سکینہ بی نے دہشت سے کانپتی بیٹیوں کو اپنی کمزور چھاتی میں سمیٹ لیا۔

''سیٹھ جی وہ منڈی گئے ہیں۔ آتے ہی ہونگے۔'' بشیرا نے کُتے کے پلّے کی طرح دُم ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ آس پڑوس کے لوگ باگ بھی وہاں جمع ہو گئے۔ برسوں سے ربیع اور خریف کی فصلیں کھلیان میں آتے ہی ایسا تماشہ گاؤں گاؤں ہوتا آیا ہے۔

''اپنی ماتا شری سے کہہ دے ننھی مل آج پائی پائی لیکر جائے گا۔'' بشیرا سہما ہوا اندر گیا اور تھوڑی دیر بعد منہ لٹکائے ساہوکار کی کرسی کے سامنے زمین پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''سیٹھ جی۔ اماں کہتی ہے آپ جاؤ۔ ابا منڈی سے سیدھے
آپ کے گاؤں آجائیں گے۔!''
''جا جا اُلو کے پٹھے۔ کہدے ننھی مل بھگوان کے ہاں سے
ضرور خالی ہاتھ آیا تھا۔ پرنتو قرضدار کے گھر سے دونوں ہاتھ
بھر کے واپس جاتا ہے۔!''

ساہوکار کی آواز میں بگولے ناچ رہے تھے جو بل کھاتے ہوئے پردے کے پار پہنچے تو بشیرا کی بہنوں کی سانس رک گئی۔ دونوں سمٹیں اور دیوار سے جالگیں۔ اس طوفانی برسات کی رات جیسی جب چھپٹ ٹپک رہی تھی۔ تبھی سر پہ بھاری گٹھر رکھے ہانپتا ہوا یونس آپہنچا۔ ساہوکار پر نظر پڑتے ہی اس کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ دس قدم کا فاصلہ دس منٹ میں طے کرتا ہوا قریب آیا اور سامان دروازہ پر اوندھا کر ننھی مل کے سامنے گڑگڑانے لگا۔

''یہ ہزار روپے بچے ہیں۔ رکھ لیجئے۔ تین مہینے میں باقی بھی ادا کر دوں گا۔! منڈی میں بھاؤ بہت گر گئے۔ بس بچوں کے لئے کپڑے لے سکا۔!

ننھی مل نے سارے کے سارے نوٹ یونس کے منہ پر دے مارے اور ہاتھی کی طرح چنگھاڑا۔

''پورے نکالو۔ ایک دھیلا کم نہیں!

وہاں موجود تمام لوگ ڈرے ڈرے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ کسی کی ہمت نہ تھی کہ چوں چراں کرتا۔ کوئی آدھے گھنٹے تک یونس گڑگڑاتا رہا۔ اس کے ہر لفظ پر گھر کے اندر سے سسکاریاں پلٹ پڑتیں اور یونس کی پسلیوں کو جھنجھوڑ دیتیں۔ لیکن ننھی مل پچاس کوس سے برساتی نالے جیسے دھڑ دھڑاتا آیا تھا۔ اور تین سال کے سوکھے کا تمام کچڑ کوڑا اسمیٹ لے جانے کا اٹل ارادہ تھا۔ سمجھاتے ہوئے بولا۔

''مورکھ کہیں کے۔ اس وقت جب بھیڑ بکریوں کی طرح ہر ایک بھاگا جا رہا تھا، میں نے کتنا کتنا کہا کہ بھاگ لو یہاں رہو گے تو ایک ایک کو بٹوارے کا قرض چکانا پڑے گا۔ بس میاں اب میرا حساب چکتا کرو۔''! اس نے کرسی چھوڑی اور اپنے کارندوں کو حکم دیا''

''جاؤ۔ دروازہ کا چیتھڑا کھینچ پھینکو۔''!

وہ ٹاٹ گھسیٹا گیا اور جیسے ظلم وانا انصافی نے لکڑی کی صلیب سے پوترتا اور تقدیس کو کھینچ لیا۔ یونس کی بیٹیاں ننگی چھاتیوں پر ہاتھ رکھے دور کنوئیں کی طرف دوڑ پڑیں اور ان کے پیچھے بشیرا تھا۔ آنگن میں سکینہ بی کی لال لال آنکھیں سکتیکن کے تیر کی طرح ان کا پیچھا کر رہی تھیں۔

میں تھکا ماندہ گھر لوٹا تو ماما ناراض سے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھا اور بھڑک اٹھے۔

'کہاں گئے تھے نریندر !ان کی آنکھوں میں غصہ لیکن چہرہ پر باپ جیسا پیار بھی تھا۔۔

''ماما جی، یونہی تالاب تک گھومنے چلا گیا تھا۔''! میں سر جھکائے کھڑا رہا۔

''ارے پاگل ہماری نہیں اپنی ماں کی پریشانی کا خیال کیا کرو۔ وہ ہر پل تمہاری فکر میں گھلتی رہتی ہے۔ تمہارے سوا اس کا کون ہے دنیا میں۔''

''دل گھبرا رہا تھا ماما جی۔ چھما کر دیں۔''

اس رات مجھے نیند نہ آئی۔ نظروں میں بابا ہی گھومتا رہا اور کانوں میں وہی درد بھری صدا گونج رہی تھی۔ ''فرید شکر گنج۔ نہ رہے دکھ نہ رہے رنج''۔!

صبح نہا دھو کر ناشتہ کیا اور ماما جی کے دفتر جاتے ہی کاغذوں کا پلندہ اٹھایا اور باہر جانے لگا کہ مامی نے کھنکھارتے ہوئے تیکھے لہجہ میں کہا۔

''کہاں چل دیئے راجکمار۔''

میں چھ مہینے سے ماما کی روٹیاں توڑ رہا تھا مگر ان کی پیشانی پر بل بھی نہ آیا۔ چاہت میں کوئی کمی نہ آئی۔ وہ برابر افسروں کی خوشامدیں کرتے رہتے کہ کہیں کیسی بھی نوکری مل جائے۔ میری قسمت ہی کھوٹی تھی۔ دوسری طرف مامی اپنے دو بچوں کی پڑھائی لکھائی کے خرچ اور میری روٹیوں کی ہر دن گنتی کرنے لگی۔'' مجھے بوجھ سمجھتی تھی۔ اس کے بدلتے تیور، بیروزگاری کا عذاب اور ماں کا تنہا آنسو بہانا اب میری برداشت کے باہر ہو رہا تھا۔

''روٹی ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔''

''کب تک نوکری کے پیچھے بھاگتے رہو گے۔ میں کہتی ہوں محنت مزدوری کرلو۔ کچھ تو ہاتھ میں آئے گا۔''!

ٹھیک ہے مامی۔ وہ بھی کرلونگا۔!

''تم نے مورکھتا کی نریندر۔ گاؤں میں ماں کے ساتھ ہی رہتے۔ وہاں بھی کھیت کھلیان ہیں۔ مزدوری کر لیتے۔''

آنسو پیتا ہوا، میں تیزی سے باہر نکل آیا۔ دل میں ٹھان لیا کہ جو ہوگا دیکھا جائیگا۔ مامی کی رسوئی میں ہرگز قدم نہ رکھونگا۔ پورا دن دفتروں اور ہوٹلوں کی خاک چھانتے بیت گیا۔ سورج ڈوبنے سے پہلے بھوک نے آنتوں کو کھرچنا شروع کر دیا۔ ہفتہ میں ایک بار ماما جی جیب خرچ کے لئے مامی سے چھپا کر پانچ روپے دیتے تھے۔ آج جیب میں اٹھنی بچی تھی۔ اس کی مونگ پھلی خریدی اور تالاب کا رخ کیا۔ اس وقت وہاں

خاصی بھیڑ تھی ۔ چہل قدمی کرنے لوگ آ جا رہے تھے ۔ میں نے وہی پیپل کا پیڑ چُنا جہاں پچھلی رات بیٹھا تھا اور پاؤں پھیلائے مونگ پھلی کھانے میں مصروف ہو گیا۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ ایکا ایکی مجھے ماں کی یاد ستانے لگی ۔ دسویں کلاس پاس کی تو ماں کے ارمان پھلجڑی بن گئے ۔ سمجھتی تھی کہ بیٹا زمیندار جاگیردار ہو گیا۔ کچھ نہیں تو پٹواری ضرور بن جائے گا۔ اسے کیا معلوم کہ دسواں پاس صبح سے بھوکا ہے۔ میں سوچتا رہا کہ ماں روتی کیوں ہے اور ماں کی تیوراب راون کے بان کیوں بن گئے ۔ میرے سامنے مونگ پھلی کے خالی چھلکے ہوا سے زمین پر تھرک رہے تھے ۔ اندھیرا بہت گھنا ہو گیا جھینگروں نے خاموشی کو گدگدانا شروع کیا تو مجھے لگا جیسے بھوک اور نیند میرے دل و دماغ کو تھپکیاں دے رہی ہے۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ۔ مایوسی نے ہاتھ پاؤں کا خون چوس لیا۔ دور دور تک میرے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ پھر کسی کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی، ساتھ ہی مانوس کھنکتی آواز ۔

''تیرے آگے کی بھی خبر۔ پیچھے کی بھی خبر''

''فرید شکر گنج ۔ نہ رہے دکھ نہ رہے غم''

میری آنکھوں میں جھما کہ سا ہوا اور آخری فیصلہ نے دماغ کے نقارہ پر چوٹ ماری۔ بڑی تیزی سے دوڑا اور تالاب میں چھلانگ لگا دی۔ لمحہ بھر بعد کوئی اور بھی تالاب میں کود پڑا۔ پانی سانپ کی طرح میرے حلق میں گھس رہا تھا اور میں بوکھلاتے ہوئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ مجھے احساس ہوا میرے بال کسی کی مٹھی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ کوئی مجھے گھسیٹ رہا ہے ۔ ہوش آیا تو آنکھیں پھاڑ کر بابا کے گھنے سفید بالوں سے ٹپکتی بوندوں کو دیکھا جو میرے ہونٹوں سے پھسل رہی تھیں ۔

''اٹھو بیٹا۔ زندگی بڑی انمول ہوتی ہے کیا نام ہے کہاں کے رہنے والے ہو۔''؟

U-110426

''نریندر'' میرے کیچڑ بھرے منہ سے نکلا ''بالم پور سے آیا ہوں۔''

''بالم پور!۔ بابا نے نفرت میں ڈوبی آواز میں دہرایا۔
''کس کے بیٹے ہو۔؟
''پرمیندر گوسوامی کا!
وہی۔ نتھی مل کا لڑکا۔!

ہاں بابا۔!
''نتھی مل۔ نتھی مل۔'' بابا زخمی شیر جیسا گرجا۔
''لے نتھی مل۔ یہ لے۔ اٹھا لے اپنے پوتے کو۔ یہ قرض کی پہلی قسط ہے۔
ایسی قسطیں بار بار ادا کرتا رہوں گا۔! وہ اٹھا اور چلاّتے ہوئے دور نکل گیا۔
''یا درب کی اور خیر سب کی!
''اس ہاتھ دے۔ اس ہاتھ لے۔''
''فرید شکر گنج۔ نہ رہے دکھ نہ رہے رنج!

☆☆☆

چُوزہ

''ماں''!......رشید کی زبان پھول جیسے گالوں سے ٹکرائی اور دُنیا میں اس کے منہ سے پہلا لفظ اُگل دیا۔زبیدہ کے بے جان جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ ہڑبڑاہٹ میں چولہے پر اُبلتی مسور کی دال میں نمک ڈالنا چاہا تو ساری شیشی خالی ہوگئی۔وہ اُٹھی اور بھاگی ہوئی پلنگ کے پاس پہونچی۔رشید اپنی نیند پوری کر کے جاگ اُٹھا تھا۔خوشی کے مارے زبیدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔کتنی جادوئی کشش تھی۔معلوم ہوتا تھا رشید نے بانسری بجادی اور زبیدہ کا اَنگ اَنگ ناگن سالہرا اُٹھا۔اس نے رشید کو گود میں اُٹھالیا اور بے تحاشہ چومتی گئی۔

''ہاں بیٹے......میرے لال......پھر کہو'ماں''......!

رشید دس سال کا ہُوا اور زبیدہ سے سوال کر بیٹھا

''ماں......ہم اکیلے کیوں رہتے ہیں؟

پانچ سال بعد رشید نے غصہ میں زبیدہ کا دوپٹہ کھینچا اور پوچھا

''ماں......بتاتی کیوں نہیں......اس کمرے میں ہم دونوں کیوں ہیں......میرا باپ کہاں ہے......''؟

چپٹی ناک، نتھنے پھولے ہوئے۔کلّے اور جبڑے چوڑے۔رنگ سیاہ، موٹے ہونٹ اور چھاتی چکّی کا پاٹ۔اِس بیڈھب شکل وصورت میں رشید بن مانس لگتا تھا۔ٹی اسٹال کے چھوٹے کپ، گلاس اور طشتریاں دھوتے صاف کرتے رشید بیس سال کی

عمر کو پہونچ گیا۔ سامنے بھورے خاں کی انڈے، مرغیوں کی دوکان تھی۔ کبھی کبھی گتّے کے بکس میں چھوٹے چھوٹے پیلے رنگ کے چوزے بھی دوکان میں چیں چیں کرتے اور رشید اپنے سیٹھ کی نظروں سے بچ کے وہاں آ دھمکتا۔ بکس میں گول سوراخ تھے جن میں سے مُرغی کے چوزوں کو دیکھ خوشی سے ناچ اُٹھتا۔ اتوار کے دن اپنا کام پورا کر کے کچھ دیر خالی بینچ پر بیٹھ گیا۔ انگڑائی لی اپنے بازو اور چوڑی کلائیوں کو گھورتا رہا۔ تبھی مالک نے اُسے پکارا۔ قریب گیا تو سیٹھ نے نرم لہجہ میں کہا:

''رشید۔ کل آؤ تو اپنی ماں کی عمر اور باپ کا نام پوچھ کر آنا!

''کیوں سیٹھ جی؟

''دھیان سے سُن بے سہارا غریب بیواؤں کو مکھیہ منتری پنشن ملنے والی ہے۔ میں تمہارے فارم بھر دوں گا!''

''کتنے روپے ملیں گے سیٹھ جی؟

''ہر مہینے ڈھائی سو روپے'' ...رشید کی باچھیں کھل گئیں۔ اُس نے اتنے روپے دیکھے بھی نہیں تھے۔ وہ حیرت سے سیٹھ کو تاکنے لگا۔ اُس کا ایک ہاتھ خود بخود بلند ہوا مانو سینکڑوں نوٹ ہوا میں اُڑتے آرہے ہوں اور اس نے اُچک کر انھیں مُٹھی میں دبوچ لیا ہو۔

''کیا کرتا ہے۔ پاگل ہوگیا''! سیٹھ کی کڑک دار آواز نے رشید کے پل بھر کے سپنے کو چکنا چور کر دیا۔ رشید کی مٹھی میں ٹوٹتے گلاس نے کئی چھید کر دیے اور خون کی ڈھیر ساری موٹی بوندوں نے قسمت کی لکیروں کو چھپا لیا۔ اُس نے کھسیاتے ہوئے اپنے ہاتھ کو زور سے جھٹکا دیا اور قمیض سے خون پوچھنے لگا۔

''تیرے حساب میں دو روپے وصولی لکھدی۔ جا کام سمیٹ!''

رشید تھکا ماندہ دیر رات گھر آیا اور ہمیشہ کی طرح زبیدہ سے سوال کیا

''ماں۔ میرے باپ کا نام اور تمہاری عمر بتاؤ''!

زبیدکواٹھارہ سال پہلے اپنے بیٹے کے منہ سے نکلے ہوئے ماں کے لفظ سے اُکتاہٹ ہونے لگی۔اُس وقت رشید نے اُسے پکارکر دُنیا کے اُتار چڑھاؤ سمجھنے کی تمنا کی تھی۔وہ نہیں جانتی تھی کہ ایک دن ممتا کو برہنہ ہوکر کوکھ کے زخم دکھانے ہونگے۔ایسی کوکھ جوٹوٹے ہوئے قطب نما کی طرح بیٹے کوصحیح سمت بتانے سے لاچار تھی۔زبیدہ کی آنکھیں نم ہوگئیں۔وہ جانتی تھی رشید کی عقل ایسے کسیلے کاڑھے جیسی ہے جوکئی جڑی بوٹیوں کواُبال کر بنایا گیا ہو۔اُس کی تلخی دوا ضرور ہے لیکن اثر دیر میں ہوتا ہے۔

زبیدہ جوان ہوچکی تھی۔پانچویں درجہ تک میونسپل اسکول میں پڑھنے کے بعد گھر میں سِلائی کڑھائی سیکھنے لگی۔وہ جانتی تھی بارش آتی ہے تو ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔درختوں کی شاخیں شور مچانے لگتی ہیں۔آسمان سیاہ ہوجاتا ہے۔اور بجلی کڑکتی ہے۔اُسے نہیں معلوم تھا کہ آندھی میں کمزور پیڑ جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں چھوٹے مکان دھڑ دھڑا کر گر جاتے ہیں۔دریاؤں میں طغیانی آتی ہے اور سینکڑوں گاؤں بہہ جاتے ہیں۔ہزاروں لوگ موت کی نیند سو جاتے ہیں۔اُس رات بھی شاید سیلاب آیا۔گھر کا پُرانا دروازہ ہتھوڑے جیسی مار سے زمین پر آ گرا۔بعد میں پتہ چلا کہ وہ زلزلہ تھا۔جس کی آمد کا پتہ چلانے والا کوئی آلہ دیش میں نہیں تھا۔دیواریں کانپنے لگیں۔چھت گرنے کوتھی۔اماں اور ابا کے منہ سے چیخ بھی نہ نکلی۔ایک ہی دھمک میں گر پڑے۔زبیدہ کے اوپر چٹانیں آپڑیں جسم کے سارے کپڑے پیاز کا چھلکا بن گئے۔اُس کی کراہیں دِل دہلانے والی فریادیں چوڑیاں ٹوٹنے کی آواز میں دب کر رہ گئیں۔

رشید نے روٹی کا نوالا توڑا اور رکابی میں رکھ دیا۔ماں کو روتے نہ دیکھ سکا۔

''تم روتی کیوں ہو؟۔جب کچھ پوچھوں رونا پیٹنا شروع کردیتی ہو۔کیا ہوگیا ماں تمھیں؟''

''میرے نصیب میں خون کے آنسو اور خون کے گھونٹ ہیں۔آج کیا کہنا چاہتا ہے''۔

''ماں۔بس اتنا بتا دے میرے باپ کا نام کیا ہے اور تمہاری عمر کتنے سال ہے؟ ٹھیک ٹھیک بتانا۔ ہر مہینے ڈھائی سو روپے ملیں گے!

زبیدہ بھونچکی رہ گئی۔ انگلیاں نچاتے ہوئے بولی......

''تُو سدا کا بُدّھو ہے۔ بھلا کون دیگا اِتنے سارے روپے گھر بیٹھے!

''مکھیہ منتری دیں گے بیوہ عورتوں کو!

''یہ کون سخی حاتم ہے۔ کہاں سے آئے ہیں؟

''مجھے کیا پتہ ماں۔ میں نہیں جانتا۔ سیٹھ جی کہہ رہے تھے۔ ہر بیوہ کو ملے گا۔ انھوں نے ہی پوچھا ہے!''

زبیدہ کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ کچھ لمحہ رشید پر نگاہیں ڈالیں۔ وہ لالٹین کی مَدھم روشنی میں کلوننگ سے پیدا نقلی انسان نظر آرہا تھا جو اپنی پدری شناخت کی تلاش میں گم صم بیٹھا تھا۔ زُبیدہ کو ٹی۔اسٹال کے سیٹھ کی بات گلے نہیں اُتری جو رشید کو بہلا پھُسلا کے باپ کے نام اور ماں کی عمر کے چکّر میں اُلجھا رہا ہے۔ وہ بھی کائیاں اور بُگلہ بھگت ہے۔ لومڑی جیسی للچائی نظروں سے تاک جھانک کرتا ہے۔ سوچتے سوچتے اُس نے اپنا سر پکڑ لیا اور تڑک کو بولی......

''میں بیوہ نہیں ہوں۔ کلموہے سیٹھ سے کہدے۔ یہ بھی پوچھا اُس رات وہ اور اُس کو مکھیہ منتری کہاں تھا جب ہمارے گھر پر آسمان پھٹ پڑا تھا۔ چل کھانا کھالے اور سو جا''!

''نہیں کھاؤں گا۔ پہلے ابا کا نام بتاؤ''!

''بھاڑ میں گیا تیرا باپ۔ وہاں جا۔ وہاں انڈے چوزے والے کی دوکان۔ اُس سے پوچھ لے!'' پوچھنا اُس کے ڈھیرے میں جتنے چوزے ہیں اُن کا باپ کون ہے''؟

رشید کھانا چھوڑ بستر پر لیٹ گیا۔ زبیدہ اُسے سمجھاتی رہی کہ دھن دولت والوں نے مشینیں لگا رکھی ہیں۔ جب اُن کے دل میں شیطان جاگتا ہے وہ مشین میں انڈے بھر دیتے ہیں۔ چوزے نکل آتے ہیں۔ رشید ہنستا رہا۔ ماں کی ایک بھی بات اُس کی کھوپڑی میں نہیں سمائی۔ چائے کی پیالیاں رگڑنے دھونے کے علاوہ اُس کا اُٹھنا بیٹھنا صرف محلّے کے ایسے لڑکوں تک محدود تھا جن کو پتنگ بازی اور کبوتر بازی کا شوق تھا۔ کسی نے نہ کبھی اسکول کی صورت دیکھی اور نہ ہی مندر مسجد میں جھانکنے کی عادت بنائی تھی۔ آئے دن کے لڑائی جھگڑے اور پولس والوں کی مار پیٹ نے اُنھیں غیرت اور عزّت سے دور کر دیا تھا۔ ماں باپ کا رتی برابر خوف نہ تھا۔ زبیدہ نے خود بھی نہیں سوچا کہ اُن دونوں کی زندگی کا مقصد اور مصرف کیا ہے۔

''بدّھو کہیں کے۔ بیس سال کا ہو گیا ہے۔ نہ جانے کب سمجھ آئے گی''!

''خاموش رہو ماں۔ تمہیں میری کوئی فکر نہیں۔ دیکھ لینا کسی دن بھاگ جاؤں گا۔ میں چوزہ نہیں ہوں۔ میرے دوست کہتے ہیں میرا باپ غنڈہ تھا تمہیں چھوڑ کر چلا گیا''!

رشید کے سوالات سنتے سنتے زبیدہ کے سر کے بال سفید ہونے لگے۔ جب پاؤں بھاری ہوئے تھے اُس نے چوہے مار دوا کھانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ لے دے کے صرف ماموں ہی ایک رشتہ دار بچا تھا جو میونسپلٹی میں چوکیدار تھا۔ تنہا اور کنوارہ۔ جاہل اور جُوا کھیلنے کا رَسیا۔ امّاں ابّا کا سرکار نے معاوضہ دیا۔ گھر بنانے کے لئے مدد دی۔ سارا روپیہ وصول کر کے ہڑپ کر گیا۔ پیٹ بڑھتے دیکھا تو سوچ وِچار کے بعد محبت بھرے لہجہ میں بولا تھا۔

''اب تجھ سے کون شادی کرے گا۔ زمانے والے بڑے ظالم ہیں۔ اللہ سے دُعا کر لڑکا ہو جائے۔ تیرا سہارا بن جائے گا''!

ماموں نے اتنا ہی کیا کہ بیٹے کا نام رشید رکھ دیا اور دونوں کو اپنے گھر میں

بسالیا۔ آس پڑوس والے جانتے تھے زبیدہ نے پاپ کا ٹھیکرا چھاتی سے لگا رکھا ہے، پھر بھی انھیں اس سے ہمدردی تھی۔ محلّے کے سب ہی لوگوں نے کسی نہ کسی شکل میں دُکھ جھیلے تھے۔ اُن کے گھر بھی اُجڑے تھے۔ ناگہانی موت اور بربادی کو مقدّر سمجھ لینے کے سوا کوئی چارا نہ تھا۔ رشید پانچ سال کا ہُوا تو ماموں بھی مر گیا۔ اُس کے سرہانے تکیہ کے نیچے سے پانچ سو روپے نکلے۔ زبیدہ نے اللہ کا نام لیا اور قسطوں پر سلائی مشین اٹھا لائی۔ چھوٹے بڑے کپڑوں کی سلائی کا کام بھی ملنے لگا۔ رشید اُس کا لختِ جگر تو نہ تھا بس داغِ جگر بن کے بڑھتا گیا۔ جنم سے کانٹے جیسا چُبھتا مگر ممتا کے ہاتھ نہ جانے کس مٹی سے بنائے ہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی تھپکیاں دینے کو بے قرار ہو جاتے ہیں۔ اُس کی کوکھ سے نکلا لوتھڑا راون ہو یا چنگیز۔ دودھ بھی پلائے گی اور لوریاں بھی سنائے گی۔ رشید لاکھ جبر وستم کا نطفہ ہو زبیدہ کو کنواری ماں بننے کی سوغات دے چکا تھا۔

اگلی صبح رشید اُٹھا۔ منہ دھویا اور ٹی۔ اسٹال جانے کے لئے تیار ہوتے وقت زبیدہ سے بولا

''دیکھ ماں اب میں ہٹا کٹا جوان ہوں۔ میرے ہاتھوں میں فولادی طاقت ہے۔ ایک بار بتا دو میرا باپ کون تھا۔ تمہاری قسم چوزے نکالنے کی مشینوں میں آگ لگا دوں گا''!

وہ زبیدہ کا جواب سُنے بغیر تیزی سے باہر نکل گیا۔ ۲۴ گھنٹے زبیدہ نے برداشت کر لئے وقت آگے بڑھا تو اُسے ہول اُٹھنے لگا۔ جان پہچان کے لڑکے ٹی۔ اسٹال گئے۔ شہر کے تمام گلی کوچے ڈھونڈ لئے۔ گھر گھر چھان مارے مگر رشید کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ زبیدہ دیوانی سی ہوگئی۔ رشید اُس کی ناجائز اولاد ہے کون نہیں جانتا تھا۔ نو مہینے پیٹ میں رکھنے کی برسوں سے سزا بھگت رہی تھی۔ آنکھوں کا چراغ اور دِل کا سُرور نہ سہی، تنہائیوں کا ایسا حصہ دار تو تھا، جس سے لپٹ کر وہ اپنے غم بھول جایا کرتی تھی۔ سیٹھ جی نے تھانے میں رپورٹ لکھوانے کا مشورہ دیا اور وہ دوڑی دوڑی وہاں گئی۔ حلیہ

بتایا۔ نام لکھایا۔ تھانیدار نے برچھی جیسا دھاردار سوال کیا تو زُبیدہ کو پسینہ آگیا۔

''باپ کا نام بتاؤ؟''۔ وہ کچھ نہ بولی اور خاموشی سے لوٹنے لگی۔ اُس کے کانوں سے بوڑھے ہیڈ کانسٹبل کے الفاظ ٹکرائے۔

''صاحب یہ وہی مہیلا ہے۔ نشاط پورہ والی۔ جس کے ساموہک بلاتکار پر ایس۔ پی صاحب نے خاتمے کی رپورٹ اوپر بھجوادی تھی''!۔

زبیدہ کے پاؤں کانپنے لگے۔ جی چاہا پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ سارا محلّہ اُجڑا تھا۔ نام زد رپورٹیں ہوئیں مگر ایک بھی مجرم نہیں پکڑا گیا۔ وہ کئی رات سو نہیں سکی۔ سال گزر گیا۔ اُس کے جسم کا گوشت ہڈیوں کی پردہ پوشی نہ کر سکا۔ کئی بار جی چاہا کہ تالاب میں کود جائے اور بیٹے کی جدائی کے دُکھ سے نجات پالے لیکن پڑوس کی بڑی بوڑھیاں اُسے تسلّی دیتی رہیں کہ رشید جوان لڑکا ہے۔ ایک دن ضرور لوٹے گا۔

گرمیوں کی شام تھی۔ وہ برقعہ اوڑھے ٹی۔ اسٹال کے سامنے سے گزر رہی تھی کہ سیٹھ جی نے آواز دیکر اُسے بلایا۔ بینچ پر بٹھایا اور رازدارانہ انداز میں بتایا۔

''بیٹی۔ تمہارا لڑکا بمبئی میں ہے!'' زبیدہ خوشی سے اُچھل پڑی۔'' مجھے لے چلئے اس کے پاس۔ آپ کو کیسے پتہ چلا؟

سیٹھ جی نے سارے حالات بتائے کہ رشید اکیلا نہیں گیا۔ اس کے ساتھ سبزی منڈی کے دو لڑکے بھی گھر چھوڑ کر بھاگے تھے۔ اُن میں ایک نذیر تھا۔ اس نے اپنے باپ کو خط بھیجا ہے۔ رشید کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ لفنگوں کی ٹولی میں ہے۔ چاقو چھری گھونپنے میں ماہر اور پستول بھی چلاتا ہے۔ اس کی بڑی دھاک ہے۔ زبیدہ سناٹے میں آگئی۔ سیٹھ جی کا لفظ لفظ سینہ پر مکّے برسا رہا تھا۔ اور زیادہ سُننے کی ہمت نہ رہی۔ جلدی سے اُٹھی اور بھاری قدموں سے گھر کو لوٹنے لگی۔ وہ رات بھر روتی رہی۔ نصیب پر تھوکتی اور ماموں پر لعنت بھیجتی کہ کتنی بے غیرتی سے مشورہ

دیا تھا۔ اللہ سے دعا کرنے کا کہ لڑکا ہو جائے تیرا سہارا بن جائے گا۔

دو مہینے گزرے ہونگے۔ دن موسلا دھار بارش میں بیت گیا۔ رات کو پانی کم ہُوا۔ باہر گاڑی رُکنے کی آواز آئی تو زبیدہ حیران ہوئی۔ بھاری جوتے کی دھمک اور پھر اس کے دروازہ کی کسی نے زنجیر کھٹکھٹائی۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔

''ہائے اللہ۔ رشید آیا کیا؟'' وہ ہڑبڑا کے اُٹھی اور دروازہ کھولا مگر پولس کے سپاہی دیکھ کر سانس رُک گئی۔ تھانیدار نے ٹارچ روشن کی اور پوچھا

''تمہارے لڑکے کا نام رشید تھا!''

''جی ہاں! زبیدہ کے پاؤں جیسے زمین میں دھنس گئے۔ تھانیدار نے جیب میں سے تصویر نکالی اور زبیدہ کی طرف بڑھائی۔

''دیکھو۔ ذرا پہچانو''۔ ٹارچ کی روشنی تصویر پر سمٹ آئی اور زبیدہ نے آنکھیں تصویر پر گاڑ دیں۔

سفید چادر سے ڈھکی ہوئی لاش کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ چپٹی ناک، نتھنے پھولے ہوئے۔ کلّے اور جبڑے چوڑے۔ موٹے ہونٹ۔!

''ہاں ہاں رشید ہے یہ...... کیا ہوا اُسے؟

تھانیدار نے سپاٹ لہجہ میں جواب دیا۔

''بمبئی میں غنڈوں نے مارڈالا۔ مرتے وقت نام پتہ لکھایا تھا''!

''باپ کا کیا نام لکھایا اُس نے؟۔ زبیدہ رو پڑی''

''ماں کا نام زبیدہ اور باپ کا نام بھی زبیدہ''! تھانیدار بولا۔

''کیوں مارڈالا؟۔ زبیدہ آنسو پونچھتی گئی۔

''لوکل ٹرین میں بدمعاشوں نے ایک لڑکی کی عزت لوٹنے کی کوشش

کی تھی۔ تمہارے بیٹے نے لڑتے بھڑتے لڑکی کو بچالیا مگر خود زخموں سے نہ بچ سکا!...... تھانیدار نے تصویر جیب میں رکھی اور باہر نکل گیا۔ بارش تیز ہوگئی۔ دروازہ کھلا رہا۔ زبیدہ باہر تاریکی میں اپنے چوزے کو تلاش کرتے ہوئے بڑبڑاتی رہ گئی۔ اُسے اطمینان ہوا کہ برسوں سے کوکھ میں جلتی آگ ٹھنڈی ہوگئی۔ وہ زور سے ہنس پڑی کہ لاش راون کی نہیں تھی۔''

☆☆☆

دو بوند زندگی کی

بڑے بھیا کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا اور وہ لگاتار چولہے میں سجی سجائی چھوٹی لکڑیوں کے بیچ ٹھسے ہوئے کاغذ کے ٹکڑوں میں دیا سلائی سے شعلے بھڑکا کر اب پھکنی سے چھاتی پھلا پھلا ساری سانس اگل رہے تھے۔ چنگاریاں تھیں کہ بس جگنو کی طرح چمکتیں اور دھوئیں میں گم ہو جاتیں۔ وہ ہر روز صبح، دوپہر اور شام گزرے ۲۵ سال سے یہی کرتے آئے ہیں۔ میرے اور خود اپنے لئے چائے۔ دال سبزی اور روٹی بنانے کا ہنر اماں انھیں گھٹی میں گھول کر پلا گئی تھیں۔ دو کپ چائے بنائی۔ رات کی باسی روٹیاں نکالیں اور میرے پلنگ پر بیٹھ ناشتہ کرلیا۔ اپنے پلنگ پر رکھے اخبار کو ہاتھ میں لئے وہیں پڑھنے لگے۔ میں خاموشی سے انتظار کرتا رہا کہ وہ فارغ ہو جائیں تو مجھے ٹوائلٹ لے جائیں۔

ایکا ایک انھوں نے نفرت سے اخبار دور پھینک دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ چھوٹے سے دو کمروں کے سفالہ پوش مکان میں زلزلہ کا جھٹکا سا آ گیا۔ بستر پر دونوں ہاتھ ٹیکتے ہوئے میں نے گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی اور آنکھیں پھاڑے بڑے بھیا سے پوچھا۔

''کیا ہوا بڑے بھیا؟

انھوں نے غصہ سے زمین پر تھوکا اور نم آنکھوں سے چھت کو تاکنے لگے۔ ٹوٹی کھپریل سے سورج کی جھانکتی کرنیں بجھی ہوئی لالٹین کی دھندلائی کانچ کی چمنی سے

کھلواڑ کر رہی تھیں۔ بڑے بھیّا کا غصہ بھی بس ایسا ہوتا جیسے نئے کورے گھڑے سے پانی کی ننھی ننھی بوندیں پھسل کر اسی میں جذب ہو جاتی ہیں۔ وہ میرے سب کچھ تھے۔ باپ، ماں اور فرشتے جیسے بھائی۔ میں کیا تھا بس شکستہ کشتی۔ نہ پتوار نہ بادبان۔ ان کے اٹھنے، بیٹھنے، چلنے اور پھرنے سے ہوا کے جھونکے سرسراتے اور میرے زندگی آہستہ آہستہ کھسکتی رہتی ہے۔ میرے اپاہج وجود پر انھوں نے لڑکپن اور جوانی نچھاور کر دی۔ آج پچاس سال کے ہو گئے پھر بھی چہرہ پر تھکن اور اکتاہٹ کا سایہ نہیں۔ محلّہ کی مسجد کے بلند گنبد جیسے ہیں جو موسموں کی اچھی بری مار صدیوں سے جھیل رہا ہے اور خاموشی سے اذان کی بازگشت کو چومتا رہتا ہے۔

''کچھ تو بتا دیں۔ غصہ کیوں ہو گئے؟

''بھائی ادریس۔ اس اخبار میں جو کچھ چھپا ہے۔ تم پیدا ہوئے اگر جب چھپتا تو اماں مرتی نہیں!''

لوگ بتاتے ہیں کہ بڑے بھیّا پانچ سال کے تھے۔ بارش بہت زوردار ہو رہی تھی۔ ابا ندی پار کرتے ہوئے تیز دھارے میں بہہ گئے۔ ایسے بہے کہ لاش تک نہیں ملی۔ اماں درد سے تڑپ رہی تھیں۔ انھیں کچھ بھی پتہ نہ تھا۔ رات کے بارہ بجے میری پیدائش ہوئی۔ گول مٹول، گورا چٹا تھا۔ بڑے بھیّا نے دوسری صبح میرے غبارے جیسے گالوں اور آنکھوں کو اتنا چوما کہ گھبرا کر اماں نے کمزور ہاتھ سے انہیں دھکا دیدیا۔ وہ دیوار سے جا ٹکرائے۔ سر پہ بڑا سا گھومڑ نکل آیا۔ اماں ہنس دی تو وہ بھی سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کھلکھلا پڑے۔

ابا سینچائی محکمہ میں دینک ویتن بھوگی کلینر تھے۔ اماں افسروں کے پاس گئی۔ گڑگڑائی اور خوب روئی دھوئی اور سیر کو رحم آ گیا اور پندرہ روپے ... پر بیلدار رکھ لیا۔ یوں ہماری دال روٹی کا بندوبست ہو گیا۔ تین سال جیسے تیسے گزر گئے۔ بڑے بھیّا حاجی ہوٹل میں جھوٹے برتن مانجھنے دھونے پر لگ گئے۔ سویرے آٹھ بجے سے رات دس بجے

تک کام کرتے ۔ دونوں وقت پلیٹوں میں بچی ہوئی ساگ سبزی اور روٹی کے ٹکڑے کھانے پڑتے ۔ رات کو پانچ روپے مٹھی میں دبائے اپنا بچپن اماں کی تھکی ہاری گود میں ڈال دیتے ۔

''تو پھر کیا ہو جاتا بڑے بھیا''؟ وہ کمرہ میں کمر پر دونوں ہاتھ رکھے ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ہو رہے تھے ۔ میں سمجھ گیا ان کا دماغ ابھی تک اُبال پر ہے ۔ انھوں نے ہمیشہ کی طرح زخمی ہرنی جیسی نم آنکھوں سے میری بے چارگی کو گھورا اور میٹھی آواز میں بولے ۔

''تم میری طرح اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے ، مدرسے جاتے اور سڑکوں باغوں میں دوڑتے ، بھاگتے اور میرے ہاتھ نہ آتے''!

اماں مجھے گود میں اُٹھائے کام پر جاتیں اور آم کے گھنے پیڑ کے نیچے دوسرے بچوں کے ساتھ چادر بچھا کر لٹا دیتی ۔ تھوڑی دیر بعد آتی اور دودھ پلا کر واپس ہو جاتی ۔ سردیوں کے دن تھے ۔ ہفتہ بانٹنے کو اور سیر کمرہ میں مسٹر رول لئے بیٹھا تھا اور باہر مزدوروں کی قطار تھی ۔ میری نیند لگ گئی ۔ اماں چادر اوڑھا ہفتہ لینے چلی گئی ۔ گھنٹہ بھر دوپٹہ کے پلّو میں روپئے باندھے خوشی خوشی لوٹی ہو گی ۔ مجھے اُٹھایا ۔ پیار کیا ۔ میں نے آنکھیں کھول کر اماں کو دیکھا ۔ وہ مشکل سے دس بیس قدم گئی تھی کہ ٹھٹھک کر رک گئی ۔ ہاتھ سے میرے دونوں ٹیڑھے میڑھے سکڑے پیر سیدھے کرنا چاہے تو جیسے اس کے ہاتھ کی ساری طاقت خوفناک چیخ میں سمٹ کر رہ گئی ۔

محلّہ کے بزرگوں نے بیوہ ماں اور ہم دونوں بھائیوں کی ذمہ داریاں اٹھانے کا فیصلہ اس وقت سنایا جب صدر ہاسپٹل کے ڈاکٹر نے مجھے پولیو کا شکار بتاتے ہوئے سمجھا دیا ۔

''موت اور پولیو سے چھٹکارا نہیں ملتا!''

اماں پر پت جھڑ آ گیا اور اس نے پلنگ پکڑ لیا ۔ بڑے بھیا نے ہوٹل چھوڑ دیا

اور مدرسے جانے لگے۔ سال بھر میں اماں کو کھانسی کھا گئی۔ بڑے بھیا اتنی سی عمر میں بڑوں کا حوصلہ پا گئے۔ ۱۴ گھنٹے ہوٹل کی کڑی محنت اور سال بھر مدرسے کی پڑھائی نے ان کی آنکھوں میں آنسو ڈھالنے والی ساری نسیں جام کر دیں۔ اماں کے تابوت تک ہاتھ نہیں پہونچ سکے۔ بس مجھے کاندھے پر سوار کر لیا اور ایک پرانی قبر پر بٹھا دیا۔ بڑے بوڑھوں نے انھیں قبر میں اُتارا کہ اماں کی کفنائی لاش کو سہارا دے دیں۔

بڑے بھیا نے بیس سال کی عمر کو پہونچ بارھویں درجہ پاس کر لیا۔ میرے پیر اپنے دونوں ہاتھ کی قینچی میں تھامے کمر پر لادے وہ سارے محلّے میں ناچتے پھرے۔ بہتے دھارے اور ٹھہرے پانی کی طرح۔ میرا اپاہج وزنی جسم وہ یوں اٹھائے جھومتے لہراتے جیسے کھلتی کلیاں شبنم کے غرور کو تھامے ہوں۔ دیکھنے والے ان کے منہ میں مٹھائی کا ٹکڑا رکھ دیتے۔ کوئی میرے ہاتھ میں لڈّو تھما دیتا۔ سرکاری نوکری تو نہ چل سکی۔ مولوی برکت علی کے پاس سیمنٹ کی ایجنسی تھی۔ انھوں نے پانچ سو روپے ماہوار کے عوض بابوگیری کا کام سیکھنے پر رکھ لیا۔

''خدا کے لئے بتائیے بڑے بھیا۔ کیا ہے اخبار میں۔ آپ کو میری قسم۔ دیکھیے میں رونے لگوں گا۔!''

وہ تڑپ گئے جیسے میری قسم نے ان کے دل میں سوئی چبھو دی۔

''یہ دیکھو کتنا بڑا اشتہار ہے۔ انھوں نے اخبار پلنگ پر میرے سامنے بچھا دیا۔ دیکھو یہ ماں ہے۔ اپنے بچے کو گود میں لئے ہے۔ اور یہ راشٹر پتی جی کا فوٹو ہے۔ ان کا سندیش بھی''!

میں نے وہ سب بڑی حیرت سے دیکھا اور اچھل پڑا۔ ویسے ہی جس طرح ٹیبل پر رکھے آئینہ میں چڑیا اپنے آپ کو دیکھ کر پُھدکتی ہے۔

''میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ یہ ڈاکٹر بچّے کے منہ میں کیا ڈال رہے ہیں؟''

''میرے بھائی۔ یہ آبِ حیات ہے۔ اُمرت ہے!'' بڑے بھیا کی پیشانی کی

سلوٹیں آب دار ہوگئیں۔ چہرہ اور آنکھوں میں مایوسی کی بدلی امنڈ آئی۔

''یہ کیا ہوتا ہے بڑے بھیّا جس سے اِمرتی میں لالی آتی ہے؟'' میں صرف سوال کرتا رہا۔ ٹانگوں سے ہی نہیں دماغ سے بھی مفلوج جو تھا۔ بڑے بھیّا نے کتنے جتن کئے۔ پڑھائی لکھائی کرلوں۔ تھوڑی روشنی آئے تو راہ دکھائی دے گی۔ ایک بار ٹھان لیا تو گود میں لئے مدرسے جا پہنچے ماسٹر کے سامنے بیٹھا دیا اور خود اپنے کلاس میں چلے گئے۔ میں ہنتے کئے مسکراتے لڑکوں کے بیچ بے بس منہ بسورے اپنے کو اینٹ روڑا محسوس کررہا تھا۔ جیسے خوبصورت گلدستہ میں کاغذ کا بھدرنگ پھول۔ کھانے کی چھٹی سے کچھ پہلے مجھے ایسا لگا کہ میری سُو سُو پر کسی نے کیل ٹھونک دی۔ میں نے بلبلا کر زوردار چیخ ماری۔ سب بچے خوفزدہ ہوگئے اور کھڑے ہوکر مجھے دیکھنے لگے۔ ماسٹر لپک کر قریب آیا۔ بڑے بھیّا کے کانوں میں جانی پہچانی چیخ دیوار پھاڑتی طوفان اُٹھا گئی۔ وہ بھاگم بھاگ بچوں کو پھلانگتے مجھ پر آن گرے۔ میں بُری طرح تڑپ رہا تھا۔

''ادریس۔ادریس۔کیا ہوا۔منہ سے کچھ تو بول۔'' ان کے گال آنسوؤں نے میری مُردہ سی آواز کو پل دو پل دے دئے۔

''میرا پاجامہ اُتاریئے۔جلدی سے۔ بڑے بھیّا جان نکل رہی ہے!'' انھوں نے ایک ہی جھٹکے میں کمر بند توڑ دیا۔ بڑی سی لال تتیا بھنبھناتی نکلی اور اُڑ گئی۔ ماسٹر نے جیب سے چونے کی چھوٹی ڈبیہ نکالی۔

''یہ چونا لگادو۔ آرام مل جائے گا!'' بڑے بھیّا نے انگلی بھر چونا چھوٹے سے لال دَدوڑے پر لگایا۔ پاجامہ ہاتھ میں تھاما اور مجھے گود میں اٹھا لیا۔ میرے بھیگے گالوں اور بہتی آنکھوں پر برف سے ہونٹوں سے پونچھنے کے بعد تیز قدموں سے گھر آگئے۔ آس پڑوس کی سیانی ماں بہنوں نے بیسیوں ٹوٹکے بتائے جنھیں بڑے بھیّا شام تک آزماتے رہے۔ درد کی لہریں اٹھنا بند ہوئیں تو سوجن بڑھنے لگی۔

آج میں سترہ ۱۷ سال کا ہوگیا۔ وہ دن اور رات کھنکھجورے کی طرح میرے

اعصاب پر ہزار پائے چپکائے ہوئے ہے۔ بڑے بھیا میرے دل کو گردش دینے والے خون کا آبشار ہیں۔ جس کی بوند بوند میں شہد گھلا ہوا ہے۔ وہ زندگی کی بکھری بے ترتیب کتاب کے ایسے لفظ بن گئے ہیں جو سونے سے تو نہیں لیکن ایسے فرشتے کے آنسوؤں سے لکھے گئے ہیں جس نے قدرت کے حکم سے ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت انسانوں کی بستی میں پہونچائی ہوگی۔ بڑے بھیا کی نیند کافور ہوگئی تھی۔ وہ بچپن سے میرے پاس سوتے رہے میرا قد کاٹھی بڑھا تو پلنگ سے پلنگ ملا لیا کہ سانس تک ان کے کانوں میں پہنچ سکے۔ ہزاروں رات چھاتی سے چمٹا کر پیشاب سے چھٹکارا دیا لا۔ گندگی دھلائی۔ کپڑے لتّے دھوبیوں سے زیادہ صاف دھوئے۔ میں جوان ہوگیا تو بھی ٹوائلٹ میں بٹھا، دروازہ بند کر باہر کھڑے رہتے ہیں۔ میری آواز پر آنکھیں بند کئے اندر آئینگے۔ لوٹے سے میرے مٹھی میں پانی ڈالتے ہیں اور کمر بند باندھتے ہی مضبوط بازوؤں میں سمیٹ لیتے ہیں۔ وہ اپنی اِن ذمہ داریوں کو فرض بنا چکے ہیں۔ جس طرح اندھے کی لاٹھی اپنی چوٹ سے راہ کی رکاوٹیں اور آنے جانے والے کی خبر دیتی ہے ویسے ہی بڑے بھیا میری ہر ضرورت اور عادت کو آنکھوں سے بھانپ کر بھاگے آجاتے ہیں۔ رات بھر پانی میں بھیگا رومال ڈنک کے نشان پر رکھتے رہے۔ اس رات پیشاب بھی بار بار آیا۔

کیسے تھے بڑے بھیا۔! ان میں کتنی طاقت تھی۔ وہ دیوتا تھے جو پہاڑ پربت اٹھا لاتے تھے۔ اب کے زمانے میں کوئی ایسا آدمی ہے جو تین سال کے بچے اور سترہ ۱۷ سال کے بھارنی رَسّے کا بوجھ ہنستے کھیلتے یوں سنبھالے جیسے کھلونے والا ڈھیر سارے بڑے بڑے غبارے بنسی میں باندھے بازار بازار سڑکوں پر گھومتا ہے۔

''بتاتے کیوں نہیں بڑے بھیا۔ آپ کیسے ہوگئے۔ راشٹر پتی ہیں۔ ماں ہے۔ بچہ ہے اور ڈاکٹر۔ کوئی سانپ بچھو تو نہیں جو اخبار پھینک دیا!''

''ارے پیارے بھیّا۔ یہ اخبار۔ یہ سندیش اور یہ آبِ حیات۔ ۱۴ سال پہلے مل جاتا تو تم۔۔۔۔!''

وہ پھوٹ پڑے۔ آنسو تب ہی پونچھے جب مجھے رونا آگیا۔

''تو تم۔ وہ بولے۔'' ایسے نہ ہوتے جیسے آج ہو!

''آپ محلّے بھر میں کیوں سب کی خوشامد کرتے پھرتے ہو کہ بچّوں کو پولیو کی دوا پلاؤ۔ کوئی سنتا نہیں۔ مجھے بُرا لگتا ہے۔ مجھ اپاہج کو ساتھ لئے جیسے بھیک مانگ رہے ہو!''

''کیا کروں ادریس۔ چار کتابیں پڑھ لیں تو ہر ایک کو اچھے راستے پر چلنے کا مشورہ دیتا ہوں''!

''اخبار میں اور کیا تھا بڑے بھیّا جو آپ لال بھبھوکا ہو گئے؟

''یہ خبر چھپی ہے کہ جاہل ملاّ کنّی کاٹ رہے ہیں۔ افواہ پھیلا دی ہے دوا پی لی تو بچّے نسل بڑھانے سے محتاج ہو جائینگے۔!

بڑے بھیّا کی باتیں رگ رگ میں تیرتی ہیں۔ آنکھوں کی پُتلیوں میں پُھول بُوٹے نہیں سمائے بس ان ہی کی تصویر گھومتی ہے۔ اتور کے دن پورے ملک میں پولیو کی بوندیں پلانے کا پروگرام تھا۔ شہر میں کئی جگہ سنٹر بنائے گئے تھے۔ بڑے بھیّا سنیچر کی رات گھر گھر مجھے لے کر گئے۔ خدا کا واسطہ دیا۔ مولوی برکت علی جیسے صاحبِ حیثیت جیسے لوگوں کی چوکھٹ پر پیشانی رگڑی۔ نتیجہ اُلٹا نکلا۔ غنڈے موالی بھڑک اٹھے۔ سب ہی نے بڑے بھیّا کو غدّار کہتے ہوئے دھتکارا اور خبر دار بھی کیا۔ دوسری صبح مجھے ہر کام سے فراغت دلانے کے بعد پیٹھ پر لادا اور پرائمری اسکول پہونچ گئے۔ باہر لکڑی کی بینچ پر مجھے اُتار دیا۔ وہ کھڑے ہی ہو پائے تھے کہ دس بارہ لاٹھیاں برس پڑیں۔ وہ تیورا کر سڑک پر گرے تو میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ بینچ سے کودا تو اوندھے منہ گر پڑا۔ ہمت جٹائی اور بندر جیسے ہاتھوں کے بل اچھلتا ہوا بڑے بھیّا کے

جسم پر لیٹ گیا۔ ہاتھوں سے ان کے سر کو ڈھانپ لیا۔ لاٹھیوں نے انگلیاں چکنا چور کر دیں تو سانپ کی سی لہر سا پلٹا اور مجھے ایسا احساس ہوا کہ میری ٹیڑھی ٹانگیں تیر کی طرح سیدھی ہو گئیں ہوں اور بڑے بھیا کے پیروں کا لیگ گارڈ بن گئیں۔

''حرامی کی ٹانگیں توڑ دو!'' دونوں جسم خون میں تر بتر ہو گئے۔ بھگدڑ مچ گئی۔ جب تک پولس آئی، غنڈے بھاگ چکے تھے۔

کیسے تھے بڑے بھیا۔ میں پڑھا لکھا نہ تھا ورنہ ان کے سر پر اپنے جسم کی ایک ایک ہڈّی کی باڑھ لگا دیتا۔ میں ان کی ٹانگوں کو، پارس منی سمجھ بیٹھا اور سر کے بھیجے کو مٹی میں ملنے دیا۔ کوئی مجھے کمر پہ لاد کے بڑے بھیا کے جنازے کے ساتھ قبرستان نہیں لے گیا۔ میں تین دن سے اکیلا بیٹھا ہوں۔ آس پاس گندگی ہے۔ لیکن میں بڑے بھیا کی یادوں میں دنیا بھر کے پھولوں کی خوشبو سونگھ رہا ہوں۔ میں چیخ رہا ہوں۔ کوئی ہے سورما باپ۔ کوئی شیرنی ماں۔ کوئی رستم بھائی جو محلّے کے بچّوں کے حلق میں آبِ حیات کی دو بوندیں انڈیل دے جو میرے آنسو بن کر بکھر رہی ہیں۔

''کوئی نہیں سنتا۔ بڑے بھیا۔ اخبار جلا دو!''

☆☆☆

پرائشچت

ریلوے اسٹیشن جانے والی ساٹھ فٹ چوڑی سڑک کے درمیان داہنی طرف وہ شاندار دومنزلہ مکان ہے جس کے سفید آہنی دروازے کی پیتل کی پلیٹ اور سیاہ موٹے حروف ہر راہ گیر کی آنکھوں کو اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ سبزی خور پل بھر میں نفرت اور خوف سے نظریں جھکا کر گذر جاتے ہیں۔ شہر کے قدیم باشندے جو وہاں کے مکینوں کی بیتی زندگی سے واقف ہیں ان کی زبان آہستہ سے گدگدا کر رہ جاتی ہے:

''ایک ایک میاں کے تین تین نام
پھچل، پھجلو، پھجل امام''

دن میں سورج کی کرنوں اور شام سے مرکری بلب کی روشنی میں ''چودھری فضل امام۔ اسکن مرچنٹ'' کی نیم پلیٹ جھلملاتی تو کئی ذہنوں میں امام بخش سبزی فروش کی چھوٹی سی دوکان میں کُرتے کی آستین سے ہر وقت اپنی بہتی ناک پونچھتے ہوئے دُبلے پتلے دس سال کے پھجلو کا چہرہ ناچ اُٹھتا ہے۔ اس نے آلو پیاز اور لہسن ادرک کا مول تول سمجھا ہی تھا کہ ماں ٹی۔ بی میں خون اُگل اُگل کر چل بسی۔ دو سال بعد ہی باپ امام بخش پاخانہ میں پھسل کا گر پڑا۔ سر میں ایسی چوٹ آئی کہ پندرہ دن بے ہوش رہا اور سولہویں دن اس کے دل کی دھڑکن بھی بند ہوگئیں۔ پھجلو کا چچا کریم بخش محلہ کی مسجد میں جھاڑو دینے اور مٹی کے گھڑوں میں ہر روز پانی بھرنے کے بعد پھجلو کا ہاتھ پکڑ کر سبزی کی دوکان پر بیٹھنے لگا۔ کریم بخش نے بڑی محنت اور لگن سے اپنے یتیم

بھتیجے کی دیکھ بھال کی۔ لڑکپن کی حدیں پار کرادیں اور شادی کی علت سے پلا جھاڑ سبزی فروشی کا لبادہ بھی اُتار پھینکا۔ پانچ سال دونوں نے جمن بھائی کی دوکان پر پسینہ بہایا۔ پھجلو کا کام تھا کہ شام کو بھینسوں اور پاڑوں کو ہانک کر بوچڑ خانے لے جائے۔ چچا کریم گوشت کے بڑے ٹکڑوں کی صفائی اور تکا بوٹی کے فن کو سمجھنے سیکھنے کے ساتھ میں پتھر کی سلی پر چھریوں کی دھار تیز کرتا رہتا۔

بقرعید سے دو دن پہلے کمرہ میں بیٹھ کر دونوں نے پانچ سال کی کمائی کا حساب لگایا۔

''بیٹا پھجلو۔ دیکھ اور سمجھ ہماری انٹی میں تو سو روپیئے ہیں اور کھوپڑی میں ایک نئی اسکیم چل پڑے تو بیٹا تیرا مقدر تو پٹری پر آجائے گا۔''

بھتیجے کو چچا کا مشورہ بھا گیا۔ عید کے دن دونوں نے کرایہ کی سائیکل اٹھائی اور قربانی کے تینوں دن گلی کوچے گھوم کر بکروں کی بیس کھالیں خرید لیں۔

بوند بوند سمندر بنتا گیا۔ ان کی محنت رنگ لاتی گئی اور دس سال میں چودھری فضل امام اسکن مرچنٹ کی ساکھ اور دھاک مدراس سے کلکتہ تک بازاروں میں چھا گئی۔ شیشوں کے آراستہ شوروم میں لکڑی کے دیوان پر فوم کے موٹے گدّے اور گاؤ تکیے سے ٹکے بیٹھے چچا کریم کی کمر جھک گئی اور ہاتھوں میں رعشہ آ گیا۔ چنے کی دال، آلو، میتھی کی بھاجی اور جوار کی روٹی نے اس کے انگ انگ میں طاقت کا باندھ باندھا تھا وہ مرغ مچھلی اور انڈے پراٹھوں کے سیلاب میں بہہ گیا۔ جمعہ کی نماز پڑھ کر آیا صحن میں داخل ہوتے ہی چکر آئے۔ سنبھلنے کی کوشش کی تو سینہ تھامے زمین پر گر پڑا۔ جمیلہ بوا نے دیکھا گھبراتی دوڑی دوڑی گیٹ پر گئی اور دربان کو بلا لائی۔ بڑی مشکل سے چچا کریم کو اٹھایا اور پلنگ پر لٹا دیا۔ پانی کے چھینٹے مہنہ پر مارے مگر چچا کا ہاتھ چھاتی سے نہیں ہٹا تو دربان نے چودھری کو تابڑتوڑ فون کر دیا۔

چچا کریم کو سب سے بڑے نرسنگ ہوم میں داخل کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے بتایا دل کا دورہ بہت شدید تھا۔ خدا تو کارساز ہے ہی بھلا ہو لکھ پتی بھتیجے کا کہ ایک ہزار روپیہ روز کے ایرکنڈیشنڈ پرائیویٹ وارڈ نے چچا کریم کی اکھڑتی سانسوں کو قابو میں کرلیا ورنہ جمن بھائی کی مویشی کو لانے لے جانے والے پھجلو میں اتنی ہمت اور طاقت نہ ہوتی کہ چچا کریم کو کفن اور قبر کے عذاب سے بچالیتا۔ کانپتے ہاتھوں سے چچا کریم نے فضل امام کا بازو پکڑا اور دھیمی آواز میں بولا۔

''بیٹا پھجلو'' بڑے ڈاکٹر کی موجودگی میں پھجلو لفظ گوشت کے چھیچھڑے کی طرح چودھری فضل امام پر آلپٹا۔ اس نے خون کا گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

''بولو چچا!

''سُونا گھر بھڑوں کا راج۔ ویران صحن اور خالی کمرے دن رات ڈستے ہیں۔ میری بات مان لے پھجلو بیٹے!

''جلدی کہہ ڈالو۔ کیا بات ہے؟ چودھری نے اپنے ہونٹ چچا کے کانوں کے قریب لاکر آہستہ سے کہا ''خدا کے لئے چچا۔ پھجلو۔ پھجلو کی رٹ ختم کرو۔ ڈاکٹروں کے سامنے گالی معلوم ہوتی ہے''۔!

''دیکھو چودھری! چچا کی آنکھیں بہہ نکلیں۔'' میری تو گھنٹی بج گئی۔ نہ جانے کب بتی گل ہو جائے۔ تیری وجہ سے میں نے گھر نہیں بسایا۔ اب تو شادی کے لئے ہاں کہہ دے''!

کافی حیل حجت کے بعد فضل امام نے ہامی بھردی۔ پندرہ دن بعد چچا کریم گھر آگیا۔ اسے ڈاکٹروں نے پوری طرح آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ دوسرے دن اُس نے جمیلہ بُوا کو اپنے کمرہ میں بُلایا۔

''بُوا۔ تمھیں دس سال ہو گئے چچا بھتیجے کی خدمت کرتے۔ یوں سمجھو ہم تینوں میں رشتہ ہو گیا ہے۔ میرا ایک کام

کروگی''؟

''حکم کرو چچا!

''پھجلو شادی کے لئے راضی ہوگیا ہے۔ ہم دھن دولت والے ضرور ہو گئے ہیں لیکن اپنی اوقات نہیں بھولے۔ چھوٹے گھر کی نیک لڑکی تلاش کرو''!

''کون سا بڑا کام ہے۔ اللہ معاف کرے چاچا لڑکیاں تو آج کل پلاسٹک کی تھیلیوں کی طرح سڑکوں پر بکھری پڑی ہیں مجھ پر چھوڑ دو ہیرا لاؤنگی''!

ہفتہ بھر کی بھاگ دوڑ نے جمیلہ بوا کو موتی مسجد کے موذن شیخ ستار کی چار بیٹیوں میں سے منجھلی بیٹی سلمٰی پسند آگئی۔ اُس کا فوٹو لیکر وہ فاتحانہ انداز میں لوٹ پڑی مگر اپنے پیچھے شیخ جی کے کچے مکان کی دیواروں پر اشرفیوں کی پرچھائیاں چھوڑ آئی۔ اسے پورا بھروسہ تھا کہ ٹاٹ پر ریشم کا بخیہ ضرور لگ جائے گا۔ چچا کریم نے لفافہ تکیہ کے نیچے رکھ لیا اور خاموشی سے جمیلہ بوا کی زبانی شیخ ستار، اور اس کی بیٹیوں کی بے داغ غربت، اذان کی برکت، روزہ نماز کی پابندی، سلمٰی کے طور طریقہ اور قد و قامت سنتا رہا پھر کروٹ بدل کر بولا۔

'ٹھیک ہے بوا۔ پرسوں پھجلو مدراس سے لوٹ آئے۔ تصویر دیکھ لے تو آگے بات کریں گے''!

محرم سے دس دن پہلے چچا کریم نے اپنے بیمار ہاتھوں سے چودھری فضل امام کے سہرا باندھا اور سادگی سے سلمٰی کو بیاہ لا یا۔ شادی کی رسموں کے دوران چچا کریم نے ہونٹوں کو سی لیا کہ کہیں بچپن سے تھرکتا پھجلو بھول چوک میں زبان سے نہ پھسل پڑے۔ سارے مہمان اور سسرال والے چودھری فضل امام کہتے نہ تھکتے تھے۔ قاضی جی نے بھی نکاح نامے میں خوشخطی سے موٹے حروف میں چودھری فضل امام ولد چودھری امام بخش لکھا تو چچا کریم بھی پہلی بار اپنے ان پڑھ ہونے پر شرمسار ہوا۔

اٹھارہ سال کی سلمیٰ چاند کے مخملی سائے میں انگارے جیسی دہکتی تھی۔ پانی سے لبالب بالٹی کڑاکے کی ٹھنڈی رات میں انڈیل دو تو انگیٹھی میں تلملاتی چھنچھناتی بوندیں پلک جھپکتے چھوئی موئی ہو جائیں۔ فضل امام اور سلمیٰ کی عمر میں ستائیس سال کا فاصلہ بھر پور شوخ اُمنگوں کے فیتے سے ناپا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ پتھریلی دوری پھجلو کی انا اور مرد پن کو راجہ پورس کے ہاتھیوں جیسا روند گئی۔ ماں چوتھی کا جوڑا لائی تو ہونٹوں پر مُرجھائی مسکراہٹ لئے سلمیٰ دھیرے سے بولی

''امّی۔ گلے میں پڑا ڈھول بجانا ہی پڑے گا''

ماں کا انگ انگ خوشی سے بھڑک اُٹھا۔ اسے تین کنواری بیٹیوں کے روشن مستقبل کی ضمانت مل گئی۔

چھ مہینے گذرے ہونگے کہ چچا کریم کا جنازہ بھی اُٹھ چلا۔ اس کا جانا ہوا او سلمیٰ کا قد آسمان چھونے لگا۔ آہستگی سے شیخ ستار مؤذن کی بیٹی نے نشیلی آنکھوں، اور کھنکتی آواز سے ایسا جال بننا شروع کیا کہ چند ہی ہفتوں میں چودھری فضل امام پنجرے میں بند طوطے کی طرح، بی بی جی بولو، رٹنے لگا۔ بقرعید سے دو دن پہلے سلمیٰ نے اس پر برتری اور حکمرانی کا پہلا تیر چلایا۔

''دو خصّی بکرے دادا میاں اور دادی ماں کے نام سے قربان کرا دیں۔ میں ان کی چہیتی پوتی تھی۔ جان چھڑکتے تھے'' فضل امام کی رگوں میں پرانا پھجلو اُچھل پڑا۔ وہ سر سے پیر تک خاکساری، عاجزی اور محرومی سے بھیگ گیا۔

''ہم بھی تو تم پر جان نثار کرتے ہیں۔ دو کیوں چار کی قربانی کر دیں۔ تمھارے گھر بھی بکرا بھجوا دیں''!

''بھول سے بھی غلطی نہ کر بیٹھیں۔ ابا کے پاس حق حلال کی کمائی اجازت دیگی تو قربانی کریں گے۔ ورنہ نہیں!''

سلمیٰ کی آواز میں شیخ ستار کی غربت اور لاچاری سمٹ آئی۔

''میری مانو۔ بکرا اپنے ہی گھر ذبح کروا کر گوشت بھجوا دیں گے۔ چودھری فضل امام کی سسرال ہے کسی ایرے غیرے کی نہیں۔ بس آگے کچھ نہ بولنا۔''!

سلمیٰ نے فضل امام کی شناخت کو ہلتے ڈولتے دیکھا تو اٹھلا کر کہدیا۔

''جیسی مرضی۔ اور ہاں قصائی کو پابند کر دیں۔ پائے بھنوانا نہ بھول جائے۔ اب کے ٹھنڈ بہت ہے۔ پائے اور جوار کی روٹی کھانے کو دل مچلتا ہے''

چودھری فضل امام جب پھجلو تھا تو اپنے لڑکپن میں جب بھی سڑک کنارے ڈگڈگی بجاتے مداری اور اس کی آواز پر ناچتے منکتے ریچھ کا تماشا دیکھتا تو دانتوں میں انگلی دبا کر گھنٹوں سوچتا کہ نتھنوں کی بل دار رسی اتنے بڑے ڈیل ڈول والے خونخوار درندے کو کیوں کر حکم کا غلام بنا دیتی ہے۔ اس ہی رات ریلوے اسٹیشن روڈ کا دو منزلہ مکان اور شہر سے پندرہ کلومیٹر دور ندی کے کنارے کی زرخیز بیس ایکڑ زمین کے کاغذات پھجلو نے سلمیٰ کی سونی گود میں ڈال دیئے۔ دھن دولت کے بوجھ تلے اولاد کی تمنا ہمیشہ کے لیے دفن ہوگئی۔

چودھری فضل امام اسکن مرچنٹ کے مکان سے ایک فرلانگ آگے سڑک کے پار سیلز ٹیکس ڈپارٹمنٹ کے آٹھ بنگلے تھے۔ دو نمبر بنگلہ کے لان میں سیلز ٹیکس آفیسر شانتی لال جین ہاتھ میں اپنے بیٹے کا کرکٹ بیٹ لئے کبھی ادھر کبھی ادھر نشانہ سادھے اُچھل کود کر رہا تھا۔ دسمبر کی ٹھنڈ تھی لیکن پیشانی پر پسینہ کی بوندیں آنکھوں میں طیش اور نفرت چنگاریاں دہکا رہی تھی۔ اُلٹے ہاتھ سے دھوتی سنبھالتا تو پل بھر بعد چنبیلی کے منڈوے تلے رکھے گملوں کی طرف گھات لگائے لپکتا۔ پچاس پچپن کی عمر رہی ہوگی۔ دماغ میں داؤ پیچ سانپ جیسے لہرا رہے تھے۔ اس نے شاید پرتگیا کر لی تھی کہ دھرم کی پوترتا کو للکارنے والے اپنے پرانے دشمن کو آج کس قیمت پر نہیں چھوڑے گا۔ اس نے کئی بار فائل

تیار کی اور ڈپٹی کمشنر سے زبانی بھی اجازت چاہی کہ چودھری فضل امام پر چھاپہ ڈالا جائے۔ وہ برسوں سے ٹیکس کی چوری کر رہا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ڈپٹی کمشنر کو پابندی سے چمڑے کے تاجر دیوالی سے پہلے سرفراز کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ فائل لوٹ کر شانتی لال جین کے پاس واپس نہیں آتی۔

وہ چنڈال ہر سال چودھری فضل امام کے مکان کی گندگی لئے مہندی کی باڑہ پھاندتا اور پیڑ پودوں میں غائب ہو جاتا۔ جین گھرانہ کی شانتی اور ارادھنا ملیامیٹ ہو جاتی۔ دوسروں کو ہولی کا رنگ گلال اچھا لگتا ہو یا بُرا، مگر بقرعید سے پہلے آس پڑوس اور دور دور سے بکروں کی گھناؤنی آوازیں سن کر شانتی لال جین کا خون کھولنے لگتا اور اس کی بیوی شوبھا کو اُلٹیاں آنے لگتیں۔ اب تو اس نے طے کر لیا۔ ہمت جٹائی اور آر پار کی لڑائی کی ٹھان لی۔

''چھوڑونگا نہیں۔ مار ڈالونگا ملیچھ کو۔ کتّے کے بچّے نے جینا اجیرن کر دیا ہے''!
شانتی لال جین آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ نتھنوں سے کرودھ کا دھواں آتش دان کی چمنی بن گیا۔ بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح زمین پر پاؤں مارتے دیکھ شوبھا اندر سے دوڑی آئی۔

''دو دن سے بلڈ پریشر ہے۔ کیا ہو گیا آپ کو۔ کسے مارنے پر اُتاؤلے ہو رہے ہو؟''

شانتی لال جین نے غرّاتے ہوئے تھکی آواز میں کہا۔

''برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔ ایک ہاتھ میں سر کی دو پھانکیں نہ کیں تو نام بدل دینا۔ تم اندر جاؤ جی''!

شوبھا گھبرا گئی۔

''کس کا سر پھوڑیں گے؟ شُبھ شُبھ بولئے۔ ہنسا پاپ ہے۔ چلئے اندر چلیئے''!
''تم سے ایک بار کہہ دیا اندر جاؤ۔ وہی ہے سالا چودھری۔ کا سپوت۔ میں

اکیلا نپٹ لونگا۔ جاؤتم''! وہ اتنی زور سے چیخا کہ تلسی کی ہری بھری پتّیاں ہل گئیں۔ شوبھا کا جسم بھی تھرتھرا گیا۔ بیاہ کو پچیس سال بیت گئے تھے۔ پتی کو پہلے کبھی ایسا آگ بگولا نہیں دیکھا۔ وہ تو اپنے نام کی طرح کومل تھا۔ سویرے اندھیرے منہ ٹہلنے نکلتا تو شکر روے کا چُگا جہاں تہاں چیونٹیوں کی قطار دیکھتا پابندی سے ڈالتا تھا۔ وہ جھوٹ، کپن کپٹ اور ،کرودھ سے کوسوں دور تھا کسی کا دل ڈکھانا پاپ سمجھتا۔

''انھیں نہ جانے کیا ہو گیا ہے! شوبھا بڑبڑاتی ہوئی پوجا کی چوکی پر جا بیٹھی اور دھیرے دھیرے منتروں کا جاپ کرنے لگی۔ اسے جب بھی کوئی دکھ ستاتا، دل گھبراتا بس ماں کے بتائے منتر پڑھنے بیٹھ جاتی۔ بنگلہ کے سامنے چوڑی سڑک سے ہر شام قصائیوں کے نوکر چاکر بکرا بکری، بھینس پاڑے اور بھیڑوں کو ہانکتے ہوئے بوچڑ خانے لے جاتے دیکھتی تو آنکھیں موند لیتی۔ کیسی بیدردی سے لاٹھی سے مارتے کوٹتے۔ کمزور لاچار جانوروں کی پسلیاں کھال کے باہر صاف دکھائی دیتیں۔ جگہ جگہ سے خون رستا اور ڈنڈوں کی چوٹ سے زبانیں منہ سے باہر نکلی پڑتیں۔ شوبھا آنکھیں بند کرتی اور بوکھلا کر کھڑکی بند کر دیتی۔

آخری حملہ کرنے کی پوزیشن لیتے ہوئے شانتی لال جین نے بیٹ سر سے اونچا کیا اور پوری طاقت سے غراتے، دانت نکالتے سفید بلے کی کھوپڑی پر بھرپور وار کیا۔ بلّے کی دل دہلا دینے والی چیخ نے شوبھا کے کان کے پردے پھاڑ دئے ہڑبڑا کے چوکی سے اوندھے منہ فرش پر گر گئی۔ بوکھلاتے ہوئے بڑی مشکل سے اُٹھی اور دیوار کے سہارے برآمدے میں آ کر جو کچھ دیکھ پائی وہ اس کے ہوش اڑانے کو کافی تھا۔ چنبیلی کے نیچے بلّے کی لاش پڑی تھی خون کے چھینٹوں نے شانتی لال جین کی دھوتی کو جگہ جگہ سے رنگ دیا تھا۔ شوبھا کا سر چکرا گیا۔ اس کی پیشانی دیوار سے ٹِک گئی اپنے پر قابو پاتے ہوئے دکھ بھری آواز میں بولی۔

''کردی ہتیا، موکش کا راستہ بند کر لیا۔ ہائے۔''یہ کیا ہو گیا بھگوان!''

وہ سسک اٹھی ۔ شانتی لال جین نے بیٹ لان پر پھینک دیا۔ دھوتی کے پلّو سے چہرہ کا پسینہ پونچھا! اور پلّے کے مُردہ جسم اور بکرے کے پائے حقارت سے دیکھتے ہوئے برآمدہ میں آیا۔ شوبھا کی چھاتی دھونکنی بنی ہوئی تھی ۔ سر جھکائے بول پڑی ۔

''ذرا دھمکا کر بھگا دیتے ۔ بے زبان جانور ہی تو تھا۔''!

''جاؤ جی ۔ چُپ رہو۔ دیکھ لینا اگلی بار اُن ہاتھوں کو بھی کاٹ پھینکونگا جو بے زبان جانوروں کی گردن کاٹتے ہیں۔ تبھی اس پاپ کا پرائشچت ہوگا''!

شوبھا کا جی متلایا تو وہیں واش بیسن میں اُلٹی کردی ۔ ٹیپ کھولا اور دو تین بار کُلّی کی ۔ شانتی لال جین خاموشی سے دیکھتا رہا اور باتھ روم میں چلا گیا۔ غصّے اور تناؤ میں بھول گیا کہ شادی کے ڈیڑھ سال بعد جب شوبھا آنگن کی نالی پر اُکڑوں بیٹھے اُلٹی کررہی تھی تو وہ اور ماں بھاگتے ہوئے آئے اور شوبھا کو سنبھالا ۔ وہ فکر مند ہوا۔ حال پوچھا تو ماں خوشی سے ہنس پڑی تھی ۔

بادل تو کب کے خوب کُھل کر برس چکے تھے ۔لیکن سیاست کی چنگیزی چتونوں میں ابھی بھی بجلیاں سمٹی ہوئی تھیں ۔ موقع پا کر کڑک اُٹھتیں ۔ ہزاروں سال اوتاروں، سنتوں اور صوفیوں نے ،کرودھ جور وستم اور نفرت کی چنگاریوں سے انسان کو دور رکھا ۔مگر راکششوں نے جب گندے نطفہ سے راج نیتی کو جنم دیا تو دھرم نے اس کی نازبرداری کی اور پھلنے پھولنے کا وردان دیا۔ چودھری فضل امام کے پلّے کی لہولہان لاش بھی شانتی لال جین کی تیوریوں میں چُھپی ہوئی بجلی کا شکار تھی ۔ بیتی رات اس نے شوبھا کو اپنی نیت اور سوچ سے آگاہ کردیا تھا۔

'اہنسا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی ہماری چھاتی میں چاقو مارنے آئے
اور ہم بھیڑ بکری کی طرح سر جھکالیں ! اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ہی
دھرم کی آتما ہے !''

بارش کے موسم میں چودھری فضل امام کا معمول تھا کہ رکھشا بندھن کے بعد

جب کھیتوں میں مکا جوار پر شباب آتا اور ندی بھی اُپھان پر ہوتی تو سلمیٰ کولیکر مارشل جیپ سے ہفتہ بھر فارم ہاؤس پر گذارتا۔ ویسے ہر موسم میں کاروبار کی تھکاوٹ اور شہر کی مٹیالی فضا سے چھٹکارا پانے کو وہاں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ لیکن بارش میں سلمیٰ کا پورا گھرانہ مکا کے بھٹے اور ندی کی تازہ مچھلی کا بھرپور مزا لوٹتا۔ چار دن سے آسمان صاف تھا اور فضل امام چاہتا تھا کہ دونوں تھریشرس کی آئلنگ گریسنگ اپنے سامنے کرا کر چیک کرلے تا کہ جوار اور سویابین کھلیان میں آئے تو تھریشنگ میں رکاوٹ نہ ہو۔

کئی دن بعد سورج آب و تاب سے نکلا تھا۔ سلمیٰ جیپ سے اتر کر دالان میں بچھے دیوان پر دراز ہوگئی اور فضل امام نے نوکروں سے تھریشرس کھلیان میں لے جانے کو کہا۔

''چائے پی جائے!'' وہ سلمیٰ سے بولا اور وہیں سے باورچی کو چائے بنانے کو آواز دی۔

''اللہ کا کرم ہے اب کی بار تو فصل شاندار ہے''، سلمیٰ نے خوشی کا اظہار کیا تو چودھری ہمیشہ کی طرح موقعہ کی مناسبت سے پھجلو بن گیا

''یوں کہیئے اس سال ہر جمعہ کو ابّا یہاں آئے۔ اذان کہی اور نماز پڑھی بس برکت اور خوشحالی برس پڑی!''

سلمیٰ کی خواہش ہوئی کہ ندی پار چلا جائے۔ وہاں بیروں کا چھوٹا سا نجی باغ تھا۔ کئی قسم کے میٹھے اور کھٹ میٹھے بیری کے پیڑ تھے۔ پیوندی بیر کی دور دور بڑی دھوم تھی۔ فضل امام نے اپنے موٹر بوٹ ڈرائیور کو تاکید کی کہ ندی پار جانے کا انتظام کرے۔ ڈرائیور نے سر جھکا کر بتایا۔

''سرکار کنارے پر افسروں کی پکنک چل رہی ہے''!

''تو کیا ہوا؟ باغ ہمارا ہے''، سلمیٰ بولی۔

''نا بی جی۔ وہ لوگ تاش کھیل رہے ہیں اور دارو پی رہے

ہیں۔ بہت بلا گلا ہے!

''کون لوگ ہیں؟ فضل امام نے پوچھا۔

''سرکار سیلز ٹیکس کے افسر ہیں۔ وہی آٹھ بنگلے والے! ڈرائیور نے بتایا تو فضل امام نے نفرت سے ہونٹ سکوڑ لئے۔

''وہی ہے۔ شانتی لال جین اور اس کے یار دوست۔ سب ہی شرابی اور نشیلے ہیں۔ تم تو جانتی ہو وہ مجھ سے خار کھاتے ہیں''!

''اچھا تو ایسا کریں۔ ایک ٹوکری منگوالیں!'' سلمیٰ نے کہا اور ڈرائیور واپس دوڑ پڑا۔ وہ کبھی کھیت پر آتی جاتے وقت اپنے کارندوں کو پرس کھول کر انعام بانٹتی۔ یہی نہیں عید اور دیوالی پر ایک جوڑا نئے جوتے اور لفافہ میں بند ایک سو ایک روپیہ ہر ایک کو انعام میں دیتی۔ کبھی کوئی بیمار پڑ جاتا تو شہر سے ڈاکٹر بھیجا جاتا اور دواؤں کا انتظام بھی کیا جاتا۔ اسی لیے ہر ملازم سر آنکھوں پر حکم بجالاتا۔

ایک تھریشر کی پوری باڈی کھول کر صفائی ہوئی تو فضل امام نے پنکھے میں آئلنگ کرائی۔ جھک کر ہاتھ سے گھمایا اور کپڑے سے صاف کیا۔

''مین تو سوئچ آن کر دینا'' یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھ اور اندر کیا تاکہ ایک ڈھیلے نٹ کو کس دے۔ تبھی سوئچ آن ہوا اور فضل امام کی دہشت ناک چیخ سے آسمان بھی کانپ اُٹھا اور جیسے ندی میں طوفان آ گیا۔ اس کا داہنا ہاتھ کہنی سے کچھ اوپر سے کٹ کر کھلیان میں دور جا گرا اور فضل امام بیہوشی کے عالم میں زمین پر گر پڑا۔ تھریشر کا پنکھا تیزی سے چل رہا تھا۔ اس کی لڑکھڑاتی آواز نے سب کو سکتہ میں ڈال دیا۔ سلمیٰ بدحواسی میں دوڑی آئی اور ملازموں نے جلدی سے فضل امام کو جیپ میں لادلیا۔ اس کی بانہہ کو سلمیٰ کے دوپٹہ سے باندھ کر خون روکا۔ سلمیٰ اسٹیرنگ پر بیٹھی اور جیپ پوری رفتار سے شہر کی طرف دوڑادی۔

فضل امام کی چیخ اور بھاگتی جیپ نے شانتی لال جین کا نشہ ہوا کر دیا۔

''کچھ انھونی ہوگئی! وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھیوں سے بولا'' چلو چل کر دیکھتے ہیں''! دس بارہ افسر بوتلیں زمین پر رکھتے ہوئے شانتی لال کے پیچھے فضل امام کے کھلیان میں آئے تو بھونچکے ہالی سے پوچھا۔

''کیا ہوا!

ہالی کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ پاؤں کانپ رہے تھے۔

''وہ۔ وہ'' اس کے منہ سے کچھ نہ نکلا صرف فضل امام کے کٹے ہوئے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔

''صاحب۔ صاحب کا''! ہالی کے آنسو نکل آئے۔ تھریشر اور قریب کی زمین خون سے سُرخ ہوگئی تھی۔ شانتی لال جین نے دل میں خوشیوں کی ہمک سنی وہ دھیرے دھیرے کٹے ہوئے ہاتھ کی طرف بڑھا۔ ہاتھ کا گوشت ابھی بھی تڑپ رہا تھا۔ اس ذبح کئے ہوئے بکرے کی طرح جس کے جسم میں تھوڑی سی جان رہ گئی ہو۔ شانتی لال جین کے دماغ میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے سوچا بقرعید کے دن اس سے جو گھناؤنا پاپ ہوا تھا، بھگوان نے اس کا پرائشچت کر دیا۔ غور سے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر ہاتھ میں بندھی راکھی پر پڑی۔

''راکھی! راکھی! اس ہاتھ میں جو دوسروں کی گردن کاٹتا تھا۔ یہ تو راکھی کا اپمان ہے''

! تھوڑی دیر کو اس نے آنکھیں موندلیں۔ اس نے اتہاس میں پڑھا تھا۔ چتوڑ کی مہارانی کرناوتی نے مغل شہنشاہ ہمایوں کو راکھی باندھی تھی۔

''اونھ۔ اتہاس تو بکواس ہوتا ہے۔ ایسے اتہاس کے پنے پھاڑ دیئے جانا چاہیئے۔ وہ تو بابر کا بیٹا تھا۔ بابر۔ اونھ۔''

شانتی لال جین نے آنکھیں کھولیں اور نیچے دیکھا۔ کٹے ہاتھ میں ہلکی سے کپکپی ہوئی اور سورج کی روشنی میں راکھی کے سنہری تار چمکے تو وہ تیزی سے جھکا بے خوفی سے خون میں

تر بتر ہاتھ اٹھالیا اور جنونی آواز میں چلآیا۔

''چلو۔ گاڑی لاؤ۔ جلدی کرو۔ ابھی ہاتھ۔ میں جان ہے''؟

''کہاں چلیں ۔؟ ایک افسر نے پوچھا۔

''شہر۔ ہاسپٹل ۔ ہری اپ'' شانتی لال جین ندی کی طرف دوڑ رہا تھا اپنے پاپ کا اصلی پرائشچت کرنے۔!

☆☆☆

نروان

سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ رنگا رنگ پرندے میٹھی نشیلی سی چہچہاہٹ سے خاموشی کو توڑ چکے تھے۔ پیپل کی شگفتہ شاخیں زمین کو بوسہ دینے کے لیے جھول رہی تھیں۔ ہرا ابھرا اونچا پیپل ہوا کے جھونکوں کی مار اپنی شاخوں پر چھوڑ روز کی طرح مست دکھائی دے رہا تھا۔ خلیفہ نور خاں نے کاندھے سے تولیہ کھینچا۔ چبوترے پر بچھایا اور دو رکعت فرض ادا کر کے دعا مانگنے میں مصروف ہو گیا۔ روز کا یہ معمول خلیفہ نے جلدی جلدی پورا کیا۔ اسے خوف تو نہیں تھا مگر ایمانداری سے یہ خیال رکھتا تھا کہ سویرے پوجا کرنے والے آئیں تو انھیں ناگواری نہ ہو۔۔ پیپل ورکش کو ایک بڑا طبقہ بہت مقدس سمجھتا تھا۔ پنا سرکار کے وقت میں لوگوں کی سوچ میں پیار کا رچاؤ تھا، آنکھوں میں ہمدردی کی جھلک اور برتاؤ بات چیت میں اپنا پن تھا۔ پیپل کے نیچے پندرہ بیس فٹ چوڑے گھیرے میں چبوترہ تھا۔ کبھی یہاں پنچایت بیٹھتی تھی۔ ساون کے مہینے میں رات بھر آلہا گائی جاتی جسے سن کر بوڑھی آنکھوں میں بندیلہ راجپوتوں کی شمشیر زنی اور بہادری کی داستانیں ناچ اٹھتیں۔ ''آلہا اودل بڑے لڑیّا ان سے ہار گئی تلوار'' پیپل میں انگنت رنگینی چندیاں کیل سے جگہ جگہ تنے میں پیوست تھیں اور نہ جانے کب سے موسموں کی مار جھیلتے ہوئے منو کامناؤں کو دہرا رہی تھیں۔

سورج نکلا۔ فیاضی سے روشنی پھیلی تو خلیفہ نور خاں کی نظر چبوترے کے چاروں طرف زمین پر بکھری ہری پتیوں پر ٹکی رہ گئیں۔ سوکھی ٹہنیاں بھی ٹوٹی پڑی تھیں۔

چبوترے سے نیچے اترا۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔ کچھ پل پہلے ہاتھ پھیلائے جو دعائیں مانگی تھیں وہ بے اثر ہوگئیں۔ اسے اپنی کمزور یادداشت کا احساس ہوا اور بڑھتی عمر پر جی بھر لعنت بھیجی۔ نور خاں بھول گیا تھا کہ چار دن بعد بقرعید ہے۔ بھیڑ بکروں کی چہل پہل پر بھی دھیان نہیں دیا۔ اس کے بھلکڑ پن کا لڑکے فائدہ اٹھا گئے اور پیپل کی پتیاں توڑ کر لے گئے۔ لمبے بانسوں میں چھوٹی درانتی باندھ شیطان بچے ٹڈی دل کی طرح وہاں حملہ کرنے کے عادی تھے۔ لیکن خلیفہ ہر بار چست درست فوجی سپاہی کی کڑک دار آواز میں انھیں بھاگنے پر مجبور کردیتا تھا۔ صدیوں پہلے پنا سرکار میں قربانی کرنے والے اکا دکا تھے۔۔ اب جمہوریت کی فراخدلی سے ایسے لوگوں کی آبادی بہت بڑھ گئی تھی۔ مسجد سے اذان بھی گونجنے لگی تھی۔

خلیفہ نور خاں سفید لمبی داڑھی، ویسی ہی براق بھویں اور جھکی ہوئی مونچھیں۔ سر پر کروشیا سے بُنی ٹوپی اور ہاتھ میں لاٹھی لیے بارش چھوڑ ہر موسم میں پابندی سے وہاں آتا اور چبوترہ پر بیٹھتے ہی اس کے جسم کوانجانی توانائی اور شادابی کا احساس ہوتا۔ آج صبح گھر سے نکلا تو رات کی بیداری سے کافی دکھی تھا۔ طیش میں کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ کھانے کے بعد بڑے پوتے اسلم نے نافرمانی سے جواب دیا اور بیٹے الطاف نے پیروی کی تو وہ سمجھ گیا کہ اس کی قدر و قیمت شیونگ سوپ کی طرح گھل چکی ہے۔ اس نے اسلم سے صرف اتنا کہا تھا کہ رات دیر تک دوکان نہ کھولا کر زمانہ خراب ہے۔ اسلم نے گردن تک جھاڑ جیسے بالوں کو جھٹکا دیا اور ٹھنکتے ہوئے جواب دیا۔

''دادا جی۔ میری بزنس میں دخل نہ دیا کریں۔ ویسے بھی وہ دوکان نہیں ''اسلم ہیئر کٹنگ سیلون ہے''

خلیفہ نور خاں سر سے پاؤں تک برف ہوگیا۔ پوپلا منہ کھولے الطاف کو مایوسی اور غصیلی آنکھوں سے گھورتا رہا۔ اسے اسلم کے منہ سے بدبودار الٹی بہہ نکلنے کا گمان ہوا۔ الطاف نے بھی بے شرمی سے قہقہہ لگایا۔

''ابا۔ کیوں جوان پوتے کے منہ لگتے ہو۔ اللہ کے فضل سے ہر روز ہزار روپیہ اٹھاتا ہے''

الطاف کی گستاخانہ تنبیہ نے اس کے ہوش اڑا دیے۔ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ کرتے کے دامن سے عینک صاف کی اور اپنی بیوی کو ادھر ادھر گردن موڑ کے تلاش کیا، جو سامنے دالان میں تخت پر بیٹھی کانجی ہاؤس میں بند کمزور گائے جیسی نظر آ رہی تھی۔

''سن رہی ہو خاتون بی۔ اپنی کوکھ کے مہنہ پھٹ سپوتوں کی باتیں۔ ہماری اب کوئی اوقات نہیں!''

وہ زور زور سے زمین پر لاٹھی مار کر اپنی ناقدری پر غصہ کا اظہار کرتا رہا۔ حرام خور بھول گئے یہ لاکھوں کا مکان شہر بھر میں عزت، پتا سرکار کے تمغے باپ دادا کے قبروں پر دمک رہے ہیں۔ جدھر دیکھو بچوں تک کی زبان پر خلیفہ جی خلیفہ جی۔ کوئی سرپھر ابھی نائی نہیں کہتا حجام نہیں کہتا۔ عزت سے شا۔ی بیاہ میں بلائے جاتے ہیں۔ راجے مہاراجوں کی حجامت کی ہے۔ ناف کے نیچے تک پہنچ تھی۔ خاتون بی کی آواز نے اس کے جنون کو لگام لگائی۔

''اللہ کے بندے۔ دیواروں کو سنا رہے ہو'' سب اپنے کمروں میں جا سوئے۔ تم بھی آنکھیں بند کر لو!''

وہ لیٹ تو گیا مگر صبح ہوگئی اور نیند آنکھوں کو حرام ہوگئی۔

پیپل سے سے کمر لگائی تبھی کمر میں ساٹھ سال پہلے جیسی گدگدی نے کرنٹ سا دوڑا دیا۔ میٹھی اور خمار لاتی گدگدی نے رات کی کدورت کچھ کم کر دی۔ ابا نے پیار سے کہا تھا کہ پیپل سے ٹک کر بیٹھے رہ اس نے ویسا ہی کیا اور کمر مٹکاتے ہوئے زور سے ہنس پڑا تھا۔

''کیوں نورا کیا ہوا؟

''اللہ قسم ابا۔ ایسا لگا اماں گدگدی مچا رہی ہے''!

''جھوٹ تو نہیں بول رہا؟

'سچ۔ اللہ قسم یہ تو جادو ہے ابا!''

برسوں بعد جب خلیفہ نور خاں کا بیٹا الطاف پندرہ برس کا تھا وہ اس کا ہاتھ پکڑے چبوترے پر لایا اور حکم دیا۔

''اتو۔ چبوترہ پہ جا۔ تنے سے پیٹھ لگا اور بیٹھ جا''

الطاف نے خاموشی سے ویسا ہی کیا اور پل بھر بعد کھلکھلا کے ہنس دیا۔

''کیوں کیا ہوا اتو؟

''ابا کوئی گدگدی کر رہا ہے!''

''سچ کہہ رہا ہے''!

''خدا کی قسم۔ یہ کیا بلا ہے ابا''؟

مہاراجہ پنا کے خاندانی حجام کی دونسلوں کو پیپل کے اس چمتکار کا تجربہ تھا۔ وقت نے پلٹی کھائی۔ سب کچھ بدل گیا۔ زمانے کی آندھی نے نئے فیشن اور نئی سوچ سے چھوٹی بندیلہ راجاؤں کی بستی میں ایسی سینده لگائی کہ اونچے محل کھنڈر ہو گئے۔ راجپوتی شان وشوکت کا نام ونشان نہیں رہا۔ لے دے کے ہیرے کی کھدانیں، کچھ مندر اور ہرا بھرا پیپل کا پیڑ رہ گیا۔ آلہا اودل کی داستانیں بھی تک ماضی کو جگمگاتی ہیں۔

''اتو دھیان سے سن اور گانٹھ میں باندھ لے درختوں میں بھی انسان جیسی جان ہوتی ہے۔ وہ ہماری تمھاری طرح سانس لیتے ہیں!''

''تمھیں کیسے معلوم ہوا ابا؟''

''ہمارے باپ دادا نے استرے چلائے ہیں۔ گھر گھر کی ہلچل حجامت بناتے سنی ہے۔ راز کو راز رکھا ہے۔ لیکن جو گدگدی تجھے لگی، مجھے اور میرے باوا کو لگی وہ ایسا راز ہے جیسے جن جن کو معلوم ہونا چاہیے''!

''ابا یہ پیپل کہاں سے اُگ آیا؟''

خلیفہ نور خاں نے بیڑی کا کش لگایا۔ بکھرتے دھوئیں میں گزری کہانی کے حرف حرف ابھر آئے۔ وہ کہانی جسے اس کے دادا کے پرکھوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے راج گرو رگھوناتھ شاستری کو لکھتے دیکھا تھا۔ بندیلکھنڈ کے شکتی شالی مہاراجہ چھترسال بندیلہ کے دلیر اور سخی بیٹے راجہ ہردے ناتھ نے ریاست پنا کی گدی سنبھالی۔ تاجپوشی کی رسم پوری ہوئی۔ راج گرو نے پوجا کی تھالی لکڑی کی چوکی پر رکھی اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولے۔

''مہاراج اب سے آ گیا کہ اتری پہاڑی کے سامنے میدان میں بودھ ورکش لگایا جائے! راجہ ہردے ناتھ اچنبھے سے راج گرو کو گھورنے لگے۔ مسکرائے اور پوچھا
''ہمیں سمجھائیں راج گرو۔ ایسا کیوں کریں؟''

''مہابلی ۔ پیپل ورکش تلے مہاتما بودھ کو نروان پراپت ہوا تھا۔ ویر سمراٹوں اور مہاپرشوں نے اس کی پوجا کی ہے''!

راجہ ہردے ناتھ کا تجسس بڑھا وہ رگھوناتھ شاستری کا بہت سمان اور آدر کرتے تھے۔

''راج گرو۔ ذرا وستار سے بتائیں''!

''مہاراج۔ بھگوت گیتا میں بھگوان کرشن نے کہا ہے۔ میں ورکشوں میں پیپل ہوں۔ اس کے پتے ویدک منتر ہیں۔ جو اِس ورکش کو جانتا ہے وہ وید کو جاننے والا ہے!''

پنا سرکار کے منتری، سیناپتی، رئیس، جاگیردار اور ودوان درباری راج گرو رگھوناتھ شاستری کے انوکھے مشورے پر دل ہی دل میں ہنس رہے تھے۔ جھروکے میں اوپر بیٹھی رانی اور راجیہ کنیاؤں کے کنگن کھنکے۔ راجہ کا منہ چڑھا مسخرہ بھانڈ بھی خاموش بیٹھا تھا۔ راج گرو کے پتا بھی بندیلہ راج کے پروہت تھے۔ شاستری جی وید، پران،

رامائن اور گیتا کے مانے ہوئے وِدوان تھے۔ مہاراجہ چھتر سال الجھے اور کٹھن معاملات میں انھیں طلب کرلیا کرتے تھے۔

''مہابلی میں عرض کروں۔ سمراٹ اشوک نے پیپل ورکش دور دور دیشوں میں بھجوایا اور خزانے کے انیک انمول رتن چڑھائے''!

راجہ ہردے ناتھ سوچ میں ڈوب گئے۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ صرف درباریوں کے سانس لینے کی سرسراہٹ تھی۔ عام طور پر ایسا نظارہ پنا دربار میں اس وقت دیکھا جاتا تھا جب بندیلکھنڈ پر دشمنوں کے حملہ کی سُوچنا پر حکمت عملی تیار ہوتی تھی۔ راج گرو گمبھیر آواز میں بودھ ورکش کے گن بتاتے گئے۔ ہوا بند ہو جائے۔ جنگل کے تمام درختوں کے پتے تھم جائیں پرنتو پیپل کے پتے ہلتے ڈولتے رہتے ہیں۔ اس کے نیچے کوئی روگی سو جائے تو روگ دور ہو جاتا ہے۔ راج گرو دھارمک ماتاؤں کا بیان کرتے تھک نہیں رہے تھے رشی منیوں نے پیپل تلے تپیائیں کی ہیں اور دیوی دیوتا بھی وشرام کرتے ہیں۔ راجہ ہردے ناتھ پر ان باتوں نے اثر کیا۔

''بودھ گیا سے ورکش لانے کی وِوستھا کی جائے''!

دوسرے دن فوج کے سپاہیوں کی ٹکڑی اور شاہی رتھ بودھ گیا روانہ ہوگیا۔ چند مہینے بعد ایک لہلہاتا پودے رتھ کی چھتر چھایا میں پنا آگیا۔ راج گرو نے دھارمک اشلوک پڑھے، ناریل پھوڑے۔ عود اگر بتی کی خوشبو پھیلی اور پودا سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں زمین میں اتار دیا گیا۔ خلیفہ نور خاں نے بیڑی چھینکی مونچھوں پر بل دیا اور فخر سے بولا۔

''راج گرو نے خلیفہ ابرار خاں سے بھی ایک گلاس پانی پیپل کی جڑ کے آس پاس چھڑکوایا تھا''

دھوپ کی تپش بڑھی تو خلیفہ نور خاں نے سر سے ٹوپی اتار دی۔ لمبی سانس لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ماضی کے الاؤ کی چنگاریوں پر، پھونک ماری اور بجھا دیں۔ اسے رات

بہت طیش آیا تھا۔ بڑھاپا اس نے باپ دادا کا بھی دیکھا۔ بزرگوں کی مرضی کے بغیر کسی کی ہمت نہ تھی کہ کوئی کام ہاتھ میں لے لے۔ ان کی اجازت سے دوکان کھولی جاتی شیونگ اور حجامت کا سامان خریدا جاتا۔ بال کاٹنے اور شیو کرنے کے ریٹ مقرر ہوتے۔ گھر میں کتنے ہی لڑکے جوان ہوئے۔ سر صفاچٹ۔ بڑوں کو دیکھا اور سر پر مخمل کی ٹوپی جھٹ سے رکھ لی۔ نکچڑھی لڑکیوں کی شوخیاں اور باتونی عورتوں کی لپلپاتی زبانیں دروازے پر پاؤں کی آہٹ سنتے ہی گنگ ہو جاتیں۔

صبح اپنے آپ کو خلیفہ نور خاں نے راجاؤں کے عنایت کیے بڑے مکان میں بالکل تنہا اور بے بس محسوس کیا، اس کاغذ کے پرزے جیسا جو جھاڑی کے کانٹوں میں الجھ کر وجود کھو جانے کا انتظار کرتا ہے۔ بیتی رات جو کچھ سنا اس سے خلیفہ نور خاں کے دماغ کی چولیں ابھی تک ہل رہی تھیں۔ گرمی زیادہ بڑھی اور چھاتی کے سفید بالوں کو پسینہ کی بوندیں تر کرنے لگیں۔ وہ وہاں سے سیدھا مسجد والی سڑک پر چل پڑا۔ صبح جس جہنم سے نکلا تھا وہاں دوبارہ نہیں جانا چاہتا تھا۔ پیپل کی شاخیں توڑ لے جانے سے اسے احساس ہو رہا تھا جیسے باریک دھاردار درانتیوں نے اس کے ہاتھ کی انگلیاں تراش دی ہوں۔ ناخنوں سے خون رس رہا ہو۔ اسے یاد آیا کہ ایک بار چھوٹے راجکمار کی نرم و نازک انگلی کا ناخن کاٹتے وقت اس کا ہاتھ کانپ گیا اور خون کی ننھی سی بوند ابھر آئی تھی۔ راجکمار چیخ اٹھے۔ مہارانی قلانچ لگاتی آ پہنچی۔ آنکھیں تشویش سے پھٹی پڑی تھیں۔ ذرا سی بوند نے راج محل میں سیلاب اٹھا دیا۔ مہارانی وہ انگلی منہ میں چوسنے لگیں اور تھوڑی دیر بعد جب راجکمار کے آنسو تھم گئے غصہ سے بولیں۔

''خلیفہ جی۔ اب بوڑھے ہو گئے ہو۔ آج سے تم آرام کرو!

اس دن بھی خلیفہ نور خاں بہت اداس ہوا تھا۔ چمڑے کی پیٹی جس میں بڑے مہاراج کی حجامت کے برطانوی استرے اور مشین رکھی تھی خاموشی سے لا کر خاتون بی کو سونپ دی۔

''لو اب جان لیکر ٹلنے والا بڑھاپا آ گیا ہم پر۔ اس دفینے کو سنبھال کے رکھنا قیمتی سرمایہ ہے میرا''!

خاتون بی بھی روہانسی ہوگئی۔ خلیفہ نے اتنے دکھی انداز میں یہ سب کہا تو اُسے لگا جیسے سلگتے انگاروں کی سگڑی اس کے ہاتھوں میں تھما دی ہو۔ دنیا میں آنے اور جوانی کی شعلہ برساتی امنگوں کے سرد ہو جانے تک کا زمانہ اتنی جلدی بیت گیا کہ خاتون بی آنکھوں میں بکھرے کاجل کو پونچھ بھی نہ پائی۔ تیز رفتاری نے وقت کو آئس کریم کی کینڈی بنا دیا کہ ہونٹوں تک لاتے لاتے پگھلنے لگتا ہے۔

''ہائے اللہ۔ بتاؤ تو کیا ہو گیا''

''راجکمار کی انگلی سے خون نکل آیا۔ مہارانی صاحبہ نے میرے بڑھاپے کا اعلان کر دیا!''

''نہیں جی۔ تم تو ابھی پہاڑ چڑھ جاؤ!''

''دھار اسی دن بیٹھ گئی تھی جب راجے نواب گدّی سے اتر گئے۔ خاتون بی۔ میں سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا اتو سے کہو عقل کے ناخن لے۔ اب پرانا وقت نہیں رہا!''

''تمھیں سمجھا دینا۔ تمھاری بات میرے ہی پلے نہیں پڑتی!''

''کہہ دینا اب بیتے زمانے کے نہ لوگ رہے ہیں، نہ ویسی سوچ۔ بات بات پر داڑھی پکڑ لیتے ہیں''!

اس رات خلیفہ نور خاں گھر نہیں گیا۔ مسجد میں رک گیا اور کہلوا دیا وہیں سو رہے گا۔ اسے یقین تھا محلّہ کے لڑکے صبح پتّی توڑنے دوبارہ ضرور آئیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ وہ فجر سے پہلے بودھ ورکش کے نیچے آ بیٹھا۔ سورج نکلنے میں کافی وقت تھا۔ اسے دور سڑک سے قہقہے لگانے کی آواز آئی۔ وہ مسکرایا۔ ہریالی کے دشمن حملہ کرنے آ رہے تھے۔ لڑکے قریب آتے گئے۔ لیکن چبوترے پر سایہ سا نظر آیا تو خوف زدہ ہوئے اور بڑھتے

قدم روک لیے۔ خلیفہ نور خاں کی اسّی سالہ آنکھیں اندھیرا چھٹنے کا انتظار کرتی رہیں۔ پندرہ منٹ صرف چڑیوں اور دوسرے پرندوں کے چہچہاہٹ فضا میں چھائی رہی۔ لالی آسمان پر پھیلی تب خلیفہ نے اپنے چھوٹے پوتوں کو پہچان لیا۔ اس نے دھیمی آواز میں پکارا۔

''اشرف۔ اختر۔ ادھر آؤ'' دوسرے وہیں کھڑے رہے۔

''کون کون آیا ہے؟''

''دادا جی۔ نذیر اور برکت بھی ہے''!

''مفت خورو۔ تمھارا باپ اور بھائی ہزار روپیہ روز کماتے ہیں۔ دو روپلی کی پتی بازار سے نہیں لا سکتے۔''

پوتے شاید نور خاں کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ بڑے بھائی کی منہ زوری نے ان کی نگاہوں میں دادا کو بونا بنا دیا تھا۔ خلیفہ نور خاں زمانہ دیکھ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا نئی نسل اونچے گھرانے کی ہو یا چھوٹی ذات والوں کی بڑے بوڑھوں کو ایسی شکستہ دیوار سمجھتی ہے جوان کی رفتار کو اگلے وقتوں کی دُہائی دیکر روکتی ہے۔ اختر ڈھٹائی سے بولا۔

''ہمارا بکرا پیپل کی پتی خوب مزے سے کھاتا ہے!

''آپ کو کیا لینا دینا اس پیڑ سے؟'' اشرف کی زبان بھی پھسل پڑی۔

''یہاں تو بھوت اور چڑیلیں رہتی ہیں!''

خلیفہ نور خاں چبوترہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ لاٹھی اٹھائی۔

''بھوت کی اولاد۔ بھاگو یہاں سے۔ اپنے باپ سے کہنا دادا کے گلے پہ چھری پھیر دے تیرا بکرا سیدھا جنت میں جائے گا''

اشرف اور اختر انجان بنے پیپل کی سرسبز شاخوں کو تک رہے تھے۔ دادا کی باتوں کو ان سنی کر دیا اور اختر بانس لیے داہنی طرف کو بڑھا۔ اس کی بے غیرتی اور ہمت دیکھ خلیفہ نے لاٹھی بلند کی۔

''سُور کہیں کے۔ سر پھاڑ دوں گا!

ادھر نذیر اور برکت یہ ماحول اور خلیفہ کے تیور دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے اشرف بھی ڈر گیا۔ اس نے اختر کی آستین پکڑی اور گھسیٹتا ہوا سڑک پر لے آیا۔

''دادا کا بھیجا خراب ہے۔ جب دیکھو پیپل کی طرفداری کرتے ہیں!''

''ہاں! چلو بڑھے بھیا کو بتائیں گے!''

وہ جانے لگے تو خلیفہ نے چلاتے ہوئے کہا۔

''اپنی دادی سے کہہ دینا، رات کا کھانا مسجد میں بھیج دے۔ وہیں سوؤں گا''!

اسے تھکان محسوس ہو رہی تھی۔ جسم ہلکا تھا۔ دو راتوں سے نیند بھی نہیں آئی۔ مسجد میں مچھروں نے بھون کے رکھ دیا تھا۔ وہ چبوترے پر ہی لیٹ گیا۔ اگلے دن بقرعید تھی۔ اسے فکر ہوئی کہ کہیں بخار چڑھ آیا تو نماز پڑھنے کے لالے پڑ جائیں گے۔ پچاس سال میں جمعہ اور عیدین کی نمازیں کبھی نہیں چھوڑیں۔ اس کا دماغ ہچکولے لینے لگا۔ آنکھیں بند ہوتی گئیں اور وہ پوری طرح نیند میں ڈوب گیا۔

رات کے نو بج گئے تھے۔ اشرف مسجد سے ٹفن واپس لے آیا اور خاتون بی نے کہرام مچا دیا۔ ہر ایک کی لے دے کر دی۔

''الطاف۔ جا کر دیکھ کہاں ہیں تیرے ابا۔ دو رات سے گھر میں نہیں سو رہے۔ کل عید ہے۔ ان کے کپڑے استری کر دیے ہیں!''

''اماں گھبراتی کیوں ہو۔ ابا دودھ پیتے بچے نہیں ہیں۔ آجائیں گے۔ کہیں کسی دوست کے یہاں گپ شپ کر رہے ہونگے!''

''اور کیا دادی! اب بڑھاپے میں کریں بھی کیا۔ تم فکر نہ کرو''!

''چپ رہ مردار کہیں کے۔ تیرے منہ چلانے سے ہی وہ ناراض

ہوئے تھے۔ جاؤ سب جاؤ۔ انھیں لیکر آؤ'' خاتون بی غصہ میں کانپ رہی تھی۔ سر کے چھدرے بال ہوا میں اڑتے دیکھ الطاف بولا۔

''ہم جاتے ہیں اماں۔ تم سکون سے بیٹھو''

دونوں باپ بیٹے اس انہونی سے گھبرائے باہر کو نکل گئے اور یہ طے کیا کہ پہلے پیپل کے چبوترہ کی چھان بین کی جائے۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ بجلی کے پول کی روشنی میں چبوترہ بالکل خالی دکھائی دیا۔ الطاف کو کچھ یاد آیا اور اسلم سے بولا۔

''اسلم۔ چبوترہ پر چڑھ جا اور تنے سے کمر لگائے بیٹھ تو ذرا''

اسلم حیران ہوا کہ آئے تو دادا کو ڈھونڈنے کے لیے ہیں اور ابا بے تکی بات کرنے کو کہتے ہیں۔ ڈرا سہا وہ وہاں جا بیٹھا

''کچھ ہو رہا ہے اسلم''

''نہیں کچھ بھی نہیں۔ نمی سی گرتے سے چپک رہی ہے''

الطاف سٹ پٹا گیا۔ اسے یقین نہیں آیا اور خود بھی کمر تنے سے ٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیل گئیں۔ اسے برسوں پہلے کی سی گدگدی کا احساس نہیں ہوا۔ تبھی اس نے پلٹ کر چبوترے کے دوسری طرف دیکھا اور چیختے ہوئے ادھر کو کود پڑا۔

''ہائے ابا۔ ابا!''

خلیفہ نور خاں کا بیجان جسم روشنی میں دمک رہا تھا جیسے پیپل کی ساری گدگدی سمٹ کر اس کے ارد گرد ناچ رہی ہو۔

☆☆☆

جرمن شیفرڈ

میں ڈسکوری چینل دیکھنے کا پابند ہوں۔ جانوروں کی خصلت اور عادتوں کو جاننے کا بہت شوق ہے۔ آج کتوں کی دیکھ بھال کا پروگرام دماغ میں ہلچل مچا گیا۔ طرح طرح کی نسل اور قد و قامت کے کُتوں کو گوری چٹی عورتیں ٹب میں نہلا دھلا رہی ہیں۔ صابون پورے جسم سے رگڑنے کے بعد مگ سے پانی ڈالتی ہیں۔ رنگین تولیہ میں لپیٹ کے بال خشک کرتی ہیں اور کنگھے سے سنوارتی ہیں۔ بڑے پیار اور رغبت سے دو چار بوسے بھی چکھتی ہیں۔ معمولی بیماری اور چوٹ کے معاملہ میں بنا تاخیر ڈاکٹر کے کلینک پہونچ جاتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں شہر کی جھگی جھونپڑیوں میں بے شمار چھوٹے بچے ننگ دھڑنگ کیچڑ میں اچھل کود کرتے رہتے ہیں۔ انھیں کوئی گود میں اٹھا کر صاف پانی صابون سے کیوں نہیں نہلاتا۔ ان کی اچھل کود میں کتے بھی شامل ہوتے ہیں مگر ان کی زندگی مغربی کتوں کی قسمت سے کوسوں دور ہے۔

شام کے چھ بجنے والے تھے۔ میں باہر آ گیا۔ اس انوکھے کتے کو دیکھنے جو کالونی میں رہنے والے ہر شخص کے لیے عجوبہ سے کم نہ تھا۔ کتا شاید جرمن شیفرڈ تھا۔ لیکن دوغلا۔ اصیل کے کان گھوڑے کے کانوں جیسے کھڑے رہتے ہیں۔ اس کے کان جھکے ہوئے تھے۔ بلند قد و قامت۔ عمر رسیدگی اس کے دبلے اور ڈھیلے جسم نپے تلے کمزور پیر اٹھانے اور محتاط چال سے ظاہر ہوتی تھی۔ بالکل بوڑھے آدمی جیسا انداز، جو ٹھوکر لگنے کے خوف سے زمین پر آنکھیں گاڑے دھیرے دھیرے چلتا ہے۔ پچھلے دونوں

پیروں کے بال جھڑے ہوئے تھے۔ اسے صبح و شام دیکھنے کے لیے میں بے چینی کے ساتھ فلیٹ سے سڑک پر آ جاتا ہوں۔ دانتوں میں چھوٹی سی ملک کین کا ہینڈل دبائے سویرے اور شام چھ بجے جرمن شیفرڈ سامنے کی عمارت سے نکلتا اور ہولے ہولے فٹ پاتھ پر چلتا ہوا۔ پڑوس کی دودھ ڈیری میں لوگوں کی قطار کی پرواہ کیے بغیر ڈیری مالک رادھے شیام کے تخت کے پاس جا کھڑا ہوتا۔ اسے دیکھ رادھے شیام زور سے ہنستا۔

''آؤ سانبھا آؤ''

ملک کین میں مشکل سے پاؤ بھر دودھ سماتا ہوگا۔ رادھے شیام اس میں دودھ انڈیلتا اور آہستہ سے ہینڈل اسکے کھلے منہ میں دیدیتا۔

''جاؤ سانبھا''

جرمن شیفرڈ جس انکساری سے آتا ویسے ہی انداز سے اسی راستہ عمارت میں کھو جاتا۔ اس کا نام کسی کو معلوم نہ تھا۔ بس رادھے شیام ہی اسے سانبھا کہتا۔ آس پڑوس کے لوگ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ دودھ کس کے لیے لے جاتا ہے۔ میں نے کافی پوچھ تاچھ کی مگر نفی میں ہلتی گردن کے سوا کچھ نہ ملا۔ اتنا ضرور بتایا گیا کہ کتا نہایت شریف اور خاموش مزاج کا ہے۔ محلے میں کئی کتیائیں ہیں۔ جب اُن کی مستی کا موسم آتا دوسرے محلّے کے کتے آ دھمکتے ہیں مگر ملک کین والا کسی کتیا کتے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ کبھی کسی پر بھونکتے نہیں سنا گیا۔

دو بار میں عمارت کے گیٹ کے پاس جا کے کھڑا ہوا۔ فولادی دروازہ پر گرل لگی تھی۔ اندر کا منظر صاف دکھائی دیا۔ جیل کی بیرک جیسے کمرے تھے۔ ٹین کے سائبان تلے برآمدے میں بیمار اور مدقوق سے لوگ بینچ پر بیٹھے تھے۔ ہڈیوں کے ڈھانچے، پچکے گالوں پہ سر کے سفید بالوں کا جھمگھٹ۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں۔ آسیب زدہ دکھائی دیتے تھے۔ مجھے لگا وہاں انسان نہیں، بوتل سے نکلے ہوئے جن رہتے ہیں جنھیں ہر پل ان کی تلاش رہتی ہے جو کاگ بند کر انھیں اندھے گہرے کنوئیں میں دھکیل گئے

ہیں۔ جرمن شیفرڈ کی کھوج بین ناکام رہی۔ وہ دروازہ سے دائیں طرف مڑ جاتا، جہاں کے کمرے نگاہوں سے اوجھل تھے۔ مجھے اندر رہنے والے اجنبیوں سے کوئی واسطہ نہیں تھا، پہیلی صرف جرمن شیفرڈ کی تھی۔ جو اپنی حرکات سکنات سے سوتے جاگتے میرے دماغ پر دستک دے رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کتے کی یہ ذات بھیڑوں اور مویشیوں کے ریوڑ پر کڑی نگاہ رکھتی ہے۔ جنگلوں میں چوکسی کے ساتھ رہنمائی کرتی ہے اور ہر طرح کے خطرے سے مالک کو آگاہ کرنے میں ہوشیاری دکھاتی ہے۔ مجھے معلوم کرنا تھا کہ دوغلا جرمن شیفرڈ عمارت میں کس کی نگرانی کرتا ہے۔ کس کے لیے دودھ لاتا ہے۔ وہ کون خوش نصیب ہے جس کے قدموں میں کتے جیسے حقیر اور نجس جانور نے وفاداری جیسا انمول ہیرا رکھ دیا ہے۔ جسے پانے کی خواہش میں آدمی پہاڑوں کو سرمہ بنا دے تو بھی نہ پا سکے۔

دسہرہ اور دیوالی کے دن اس عمارت کے سامنے سڑک پر کاریں ہی کاریں نظر آتیں۔ قیمتی سوٹ پہنے افسر نما مرد، ریشمی ساڑھیوں میں معاشرہ کے ناسور چھپائے خوبرو عورتیں ہاتھوں میں پھلوں کی ٹوکریاں اور مٹھائی کے ڈبے لیکر اترتیں اور اندر چلی جاتیں۔ گھنٹہ بھر بعد وہ سب یوں مسکراتے واپس آتے جیسے مندر میں آراستہ مورتیوں پر شردھا سُمن چڑھا کے آئے ہوں۔ مجھے یہ سب کچھ عجیب سا لگا۔ دل میں تجسس کی لہریں اٹھیں اور کچھ دوکانداروں سے دریافت کیا۔ پتہ چلا وردھا آشرم ہے۔ ایک سندھی پرچونی دوکان والے نے مسکراتے ہوئے شوکیس میں رکھے صابون، تیل، ٹوتھ پیسٹ اور پاؤڈر کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ دیکھ رہے ہیں آپ۔ چالیس سال پہلے یہاں ٹین کے زنگ آلود ڈبّوں میں سامان رکھتا تھا۔ سمے بدل گیا۔ سب کچرہ کوڑا پھینک دیا اور نیا شوروم سجالیا''

''کیا مطلب؟''میں نے پوچھا

''گھر کے بوڑھے بھی کچرہ کوڑا ہو گئے۔ انھیں اس آشرم میں لا کے ڈھیر کر دیا اور گنگا نہا لیے!''

اب جانا کہ یہ عمارت سماج کی ٹیڑھی ترچھی چال کی ٹکسال ہے۔ میں سوچتا رہا سنسکرتی کی دُہائی دینے والے اپنے گریبان میں کیوں نہیں جھانکتے۔ جہیز کے لیے سودے بازی کرتے ہیں۔ بچوں کو کانوینٹ اسکول میں داخل کرنے کی خاطر وہاں ماتھا ٹیک دیتے ہیں اور جب تمام ارمان پورے ہو جاتے ہیں۔ بچے اعلیٰ تعلیم کے بعد بڑے عہدے پالیتے ہیں تو خود کو وردھا آشرم میں قید کر لیتے ہیں۔

میں نے کچھ طے کیا اور اتوار کے دن صبح چھ بجے بستر چھوڑ دیا، نہا دھو کر سیدھا حلوائی کی دوکان پہونچا جہاں گرم گرم جلیبیاں کڑاہی میں تلملا رہی تھیں۔ دو کلو جلیبی پولی تھین تھیلی میں رکھوائی اور آشرم آیا۔ چوکیدار سے جھوٹ بولا کہ اپنے چاچا کے پاس جاؤں گا۔ اسی وقت دوغلا جرمن شیفرڈ بھی ڈیری سے دودھ لیے آ گیا۔ میری مراد پوری ہوگئی۔ اسی کا راز لینا تھا۔ میں جرمن شیفرڈ کے پیچھے چل دیا جو آہستہ خرامی سے سر اٹھائے پانچ نمبر کمرہ کے پاس برآمدے میں رک گیا۔ اندر سے کرتا پاجامہ پہنے بوڑھا آدمی آیا اور چوکھٹ پر بیٹھ گیا۔ کتے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا کین ہاتھ میں تھام منہ سے لگائے دودھ پیا۔ وہیں رکھا ہوا ایلومنیم کا کٹورا اٹھایا اور باقی دودھ اس میں انڈیل دیا۔

''لے بیٹا شامو۔ پی لے'' بوڑھا پیار سے اس کی کمر سہلاتا رہا۔ میں نے جلیبی کی تھیلی کھولی۔

''بابا لیجیے۔ گرم ہے کھالیں''

اس نے ایسی نظروں سے دیکھا کہ مجھے لگا اسکی آنکھوں کی پتلیاں عینک کا شیشہ توڑ کے باہر نکل آئی ہوں۔

''نہیں۔ دھنیہ واد۔ میں شگر کا مریض ہوں۔ یہاں کے انچارج کو

دیدیں۔ ویسے آپ کون ہیں۔؟''

میں شہاب الدین۔ منترالیہ میں اسسٹنٹ ہوں!

''اچھا منترالیہ میں ہو'' بوڑھا شاید خوش ہوا اور بنچ پر بیٹھتے ہوئے مجھے بھی بیٹھنے کو کہا۔

''بھئی واہ کون سے ڈپارٹمنٹ میں ہو؟''

''ہوم ڈپارٹمنٹ میں!''

''ویری گڈ۔ واہ۔ سیکشن کونسا ہے؟''

''جی ایکس سیکشن میں!''

''واہ کیا بات ہے۔ بھئی مزے آ گئے شہاب صاحب۔'' میں بھی اس سیکشن کا انڈر سکریٹری تھا!'' میرے جسم میں سنسنی پھیل گئی۔ ہاتھ سے جلیبی کی تھیلی پھسلی اور نیچے گر گئی۔ میری بوکھلاہٹ پر وہ چونک گیا۔

''کیوں۔ آپ گھبرا کیوں گئے!

''آپ یہاں کیسے؟

اب بوڑھے کے دل ودماغ کو جھٹکا لگا۔ اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ چشمہ اتارا اور کُرتے سے صاف کرنے لگا۔ اس کی حرکت پر میں حیران رہ گیا۔

''بابا۔ آپ کا نام کیا ہے؟''

وہ چشمہ لگاتے ہوئے بولا

''نربدا پرشاد!''

''سرنیم کیا ہے بابا؟''

''مقدر نے سر بھی جھکا دیا اب صرف نیم رہ گیا ہے''!

میں ارادہ کر کے آیا تھا کہ جرمن شیفرڈ کا سراغ لگاؤں گا لیکن نربدا پرشاد جی خود پہیلی بن کے مجھے جھنجھوڑ گئے۔

''یہ کتا آپ کا ہے؟ جرمن شیفرڈ کی نسل ہے شاید؟

''ٹھیک سمجھا تم نے۔ یہ دوغلا ہے۔ میرے سیکشن میں احمد علی تھا۔ ایل ڈی سی۔ اس کی کتیا کا بچہ ہے۔ اپنے بیٹے راجو کے لیے بڑے پیار سے پالا ہے!''

میں نے دو جلیبی نکالیں اور کتے کے کٹورے میں ڈال دیں۔ کتا غصہ میں دانت نکال کر مجھ پر جھپٹا تو نربدا پرشاد نے اسے نرمی سے ڈانٹا۔

''نو۔ نو شامو۔ بیٹھ جاؤ! کتا فرش پر منہ رکھ کر مجھے گھورتا رہا جیسے اسے میری گستاخی سخت ناگوار لگی ہو۔ نربدا پرشاد مسکرائے اور بولے۔

''شامو کو جلیبی سے الرجی ہے۔ اصل میں راجو جلیبی کا بڑا رسیا تھا۔ میں ہر دن اس کے لیے تازی تازی لاتا تھا۔ ایک بار وہ مسوری سے ٹریننگ لیکر لوٹا تو میں جلیبی لایا۔ پلیٹ میں رکھیں اس نے دیکھا تو غصہ میں پلیٹ. پھینک دی۔ بڑا افسر تھا۔ حلوائی کی جلیبی اس کی شان کے خلاف تھی!''

مجھے ہول سا آنے لگا۔ طبیعت بے چین ہوئی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''ارے۔ کہاں چلے بیٹھو!''

''جاؤنگا بابا۔ پھر آؤں گا!''

''کہاں رہتے ہو!''

''یہیں سامنے سڑک کے پار کالونی میں''

''کبھی کبھی آجایا کرو۔ آج آئے ہو تو دل کو اچھا لگا''

''شامو کو ٹریننگ دلوائی ہے آپ نے۔ بڑی سیوا کرتا ہے آپ کی!''

''ہاں جی۔ ٹریننگ تو راجو نے بھی مسوری میں کی تھی لیکن شامو نے جو سیکھا وہی میرے جیون کا سہارا ہے''

اب میرا معمول ہو گیا کہ چھٹی کے دن نربدا پرشاد جی کے پاس آجاتا اور دو تین گھنٹے ان سے باتیں کرتا۔ آشرم میں تیس کمرے تھے اور ہر کمرہ میں دو دو بیڈ تھے۔ آشرم کے دوسرے باسی نربدا پرشاد جی کی قسمت پر رشک کرنے لگے کہ انھیں کوئی باتیں کرنے والا مل گیا۔ ورنہ وہ دسہرہ دیوالی کے منتظر رہتے تھے۔ مجھے نربدا پرشاد جی نے ماضی کی پوری داستاں سنادی۔ وہ سالہا سال ''ایکس'' سیکشن میں رہے تھے جہاں صوبہ کے خفیہ داخلی معاملات پل پل آتے رہتے اور خاموشی سے فائلوں پر چپک جاتے۔ بھورے لفافوں میں ''ٹاپ سیکریٹ'' کی لال سلپ میں ادھر سے ادھر اعلیٰ افسروں سے گزرتے ہوم منسٹر اور چیف منسٹر کے بنگلے پہونچتے۔ نربدا پرشاد جی کا ذہن بھی ٹاپ سیکریٹ تھا۔ اہم گھریلو زخموں کی کسک زبان پر نہ آئی۔ دو بیٹے تھے۔ بڑا فوج میں میجر اور چھوٹا سنٹرل سروس کا اعلیٰ افسر۔ دس سال کے تھے کہ ماں گزر گئی۔ بڑی جتن اور تیاگ سے پالا پوسا، پڑھایا اور لکھایا۔ میجر رام پرکاش جنگ میں شہید ہو گیا۔ مجھے حیرت ہوئی اور دکھ بھی۔ آج کی نسل ماں کے دودھ اور لوریوں کا بدلہ کتنی درندگی سے دیتی ہے۔ نربدا پرشاد جی نے بتایا کہ وہ پینشن ٹرسٹ میں جمع کرادیتے ہیں اور لکھ کر دیدیا ہے کہ مرنے کے بعد شاموکا خرچ اٹھائیں اور اسے یہیں رہنے دیا جائے اس کا قرض وہ سات جنم میں بھی نہیں اتار سکتے۔

اپریل کا سیکنڈ سٹرڈے تھا۔ میں ہر بار کی طرح نربدا پرشاد جی کے کمرہ پر پہونچا۔ وہ برآمدے میں بنچ پر بیٹھے تھے۔

''آؤ۔ شہاب آج بہت سی باتیں کرنی ہیں!

''طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی!

''ہاں یہ بتاؤ تمھارا سکریٹری کون ہے!

''راج پرکاش اگنی ہوتری۔ پرنسپل سکریٹری ہیں!''

نربدا پرشاد کے چہرہ پر شادابی آ گئی۔

''اچھا اچھا وہ ہیں۔ کب ہوئے پرنسپل سکریٹری؟''

''کئی سال ہو گئے۔ آپ جانتے ہیں انھیں؟''

''خوب۔ اچھی طرح۔ کیسے افسر ہیں؟''

''بہت کڑک۔ بد دماغ۔ شکّی مزاج۔ شراب بہت پیتے ہیں!

''نہیں جی۔ وہ ایسے نہیں ہو سکتے!''

''آپ کیسے جانتے ہیں؟''

''جانتا ہوں۔ تم سے زیادہ'' زبدا پرشاد کو شاید ناگواری سی ہوئی۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور چشمہ اتارتے ہوئے کہنے لگے۔

''اور بتاؤ۔ مگر تمھیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟''

''بابا۔ ان کا پی۔ اے۔ بتاتا ہے۔ میڈم بھی شراب پیتی ہیں''

''بال بچے بھی ہونگے؟''

''جی نہیں۔ شادی کو بیس سال ہو گئے''

''بیس نہیں بائیس سال۔ مجھے معلوم ہے۔ راج پرکاش کے باپ کو دس دس لاکھ کی آفر تھی۔ لڑکیوں کے باپ لائن لگائے کھڑے رہتے تھے۔ ایک کوڑی کا جہیز نہیں لیا!''

''آپ کو کیسے معلوم بابا!''

''میں جانتا ہوں۔ خوب جانتا ہوں'' انھوں نے آنسو پونچھے اور بڑی بے تابی سے اٹھ کر جرمن شیفرد کے پاس جا پہونچے۔ اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ آنسو بہتے رہے اور وہ آہستہ آہستہ کہتے گئے۔

''خوب جانتا ہوں۔ مگر یہ بھی دوغلا ہے۔ جرمن شیفرڈ ہے آریائی نسل کا۔''

گرمی کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ میں بیوی بچوں کو لینے گوالیار چلا گیا۔ چھ دن بعد لوٹا۔ اتوار کا دن تھا۔ باہر جانے کے لیے کپڑے پہن رہا تھا کہ بیوی نے سامان کی

لسٹ تھما دی۔آٹا۔ دالیں اور گھی تیل سب ہی ختم ہو چکا تھا۔ میں بیگ لیکر نیچے اتر آیا اور سوچا شام کو نربدا پرشاد جی سے ملنے جاؤں گا۔ دو گھنٹہ بعد گھر آیا اور ٹی وی دیکھنے بیٹھ گیا۔ بیوی میرے لیے چائے بنانے کچن میں چلی گئی۔ تبھی سڑک پر ہلکا سے شور اٹھا۔

'رام نام ست ہے!

میں ٹی۔وی۔ بند کر کے کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ وردھا آشرم سے ارتھی باہر آ رہی تھی۔ میں ٹھٹھکا تبھی بجلی کا کرنٹ سا پورے جسم میں دوڑ گیا۔ ارتھی کے آگے جرمن شیفرڈ دانتوں کے بیچ رسّی میں رکھی مٹی کی ٹھلیا لیے جا رہا تھا۔ جس میں سے وفاداری کے اُپلے کا دھواں اٹھ رہا تھا۔

مٹھو چتر کوٹی

کولار ڈیم کالونی کے دو منزلہ کوارٹرس ہوں یا ٹھیکے دار کی ٹین والی چادروں سے ڈھکی مزدوروں کی جھونپڑیاں، اسکے اسٹاف کے مُکان، چائے پان کی گمٹھیاں، ساگون کے پتوں اور پلاسٹک سے محفوظ چھوٹے چھوٹے ٹپر، بس سویرے سورج کی کرنیں روشنی بکھیرتیں اور رام پرشاد پنساری کے گھر سے طوطے کی آواز دوسرے پرندوں کی نشیلی چہچہاہٹ کا گلا گھونٹی ہوئی بلند ہوتی۔

''سیتارام۔مٹھوسیتارام''

''مٹھو چتر کوٹی۔کھاؤ دودھ روٹی''

ڈیم کی اونچائی پچاس فٹ ہوچکی تھی اور پہلی بارش میں ہی صدیوں سے چنگھاڑتی کولار ندی کو جیسے چٹانوں کی زنجیر نے جکڑ دیا اور وہ شانت سمندر بن گئی۔ مچھلیاں بوند لینے کو پانی کے اوپر کڑوروں بلبلے چھوڑ جاتیں۔ مانو وہ بھی ''سیتارام۔ مٹھوسیتارام'' سنتے ہی جاگ اٹھی ہوں۔ برتنوں کی کھنکھناہٹ اور کھانسنے، بلغم تھوکنے کی اپاہج صداؤں سے صبح ہو جانے کا اعلان ہو جاتا۔ یوں تو کئی مزدوروں نے مرغا مرغیاں پال رکھی تھیں۔ لیکن انکی بانگ تھکے ہارے جسموں سے ٹکرا کر دم توڑ دیتیں۔ لے دے کے رام پرشاد کا مٹھو ہی تھا جو گزرے تین سال سے کانوں میں رس گھول رہا تھا۔اکبر مرزا کا بچپن اپنی ماں کی چھاتی پر سسکنے لگا۔

''اماں۔ مجھے بھی طوطے کا بچہ منگوادو'' اماں نے اختر مرزا کا دامن تھام لیا اور

ممتا کی امر بیل لپیٹ دی۔

''کیوں بچے کی جان جلاتے ہیں۔ ذرا تو رحم کریئے۔ سامنے جامن کے پیڑ پر دن رات ٹیں ٹیں کرتے ہیں۔ ایک پکڑوا دیجئے''

الہ آباد کی پھولپور تحصیل کے غریب گھرانے سے اختر مرزا کا تعلق تھا۔ آٹھویں درجے تک پڑھائی کی تھی۔ باپ کی کوششوں سے محکمہ جنگلات میں ناکیدار کے عہدے پر ملازمت مل گئی۔ بیوی لکھنو کے خاندانی باورچیوں کا خون تھی۔ خاصے نخرے والی، لیکن گھر گرہستی میں منجھی ہوئی اور سلیقہ مند۔ رینجر اور ڈپٹی رینجر برہمن تھے۔ ناکیدارنی کی بنائی ہوئی ماش کی دال اور نیبو کا اچار فراخ دلی سے کھاتے۔ دیر تک تنکے سے دانتوں میں خلال کرتے اور ذائقہ کھرچتے کھرچتے گھنٹے بھر نیند میں ڈوبے رہتے۔ اختر مرزا نے بیوی کی ضد کے آگے سر جھکا لیا پانچویں دن طوطے کا بچہ آ گیا۔ بانس کی تیلیوں کا پنجرہ اور المونیم کی چھوٹی کٹوری اکبر مرزا کا کھلونا بن گئی۔ طوطا پانی میں بھیگے مرغی کے چوزے جیسا رات دن اونگھتا رہتا۔ پر و بال نکل رہے تھے۔ سیاہی مائل کھال پر کھیتوں میں سر اٹھاتی سبز گھاس جیسی ہلکی سی ہریالی ابھر چکی تھی۔ طوطے کی خاموشی اور اجاڑ پن سے اکتائے اکبر مرزا زیادہ وقت رام پرشاد کے بیٹے اور اپنے سہ پاٹھی للتا پرشاد کی ناز برداری میں گزار دیتا۔ مہینے بھر میں طوطا خمیری روٹی کی طرح پھولنے لگا اور ہریالا ہو گیا۔ گردن کا ہالہ بھی سرخ ہو گیا۔ اس کے حلق سے ٹیں ٹیں کے سُر ابھرنے لگے۔ اماں نے بتایا اسے سکھانے اور رواں دواں کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ صبح اکبر مرزا کو سیپارہ پڑھاتی اور طوطے پر بھی کسرت کرتی۔

''مٹھو میاں۔ نبی جی بھیجو''

''مٹھو میاں۔ اللہ ہُو۔ اللہ ہُو'' لیکن طوطا بودے ودھیارتی کی طرح اجنبی الفاظ پر کان بھی نہیں دھرتا۔ رہی سہی کسر اختر مرزا نے پوری کر دی۔

''کیوں پتھر پہ جونک لگا رہی ہو۔ للتا پرشاد کی ماں کو دے دو کچھ نہ کچھ

سکھادے گی۔''

''چھوڑیئے بھی کیا خاک سکھائے گی۔؟ وہی سیتارام۔ سیتارام''

اماں جل بھن گئی۔آپ اللہ کا نام نہیں لیتے۔

''یہ پرندہ ہی بول اٹھے تو گھر میں برکت آجائے''

اماں نے دوبارہ کمر کس لی۔حکمت عملی میں پھیر بدل کیا۔ بیٹے کے سوتے ہی پنجرہ اٹھایا اور اپنے سرہانے اسٹول پر رکھ لیا۔اختر مرزا دن بھر کا تھکا ہارا لیٹتے ہی خراٹوں کی چادر اوڑھ لیتا۔سویرے سے سائیکل اٹھاتا اور جنگل کا چپہ چپہ چھان مارتا۔ ایک ایک درخت اور خاص طور سے ساگون کی تاک جھانک کرتا کہ کہیں سے لکڑی کاٹی تو نہیں گئی۔جیسے ہی بیل گاڑیاں اور بھیل گونڈوں کے ہاتھ میں کلہاڑیاں نظر آتیں وہ شیر جیسی گرجدار آواز لگاتا۔

''ابے سور کے بچوں۔کھسک لو۔بناؤں چالان؟۔گاؤں کے بچے کاغذ پر لکھے اکھشر سمجھیں نہ پہچانیں مگر اپنے سے زیادہ صاف ستھرے کپڑے پہننے والے شہری لوگوں کے رعب دار آواز سے بڑا خوف کھاتے ہیں۔اختر مرزا کو چیختا چلاتا سن سب ادھر ادھر سرپٹ بھاگتے اور آوازیں لگاتے رہتے۔

''ناکیدار آیا۔گھوس کھور آیا''

اختر مرزا غصے سے پاگل ہوجاتا۔سائیکل جھاڑیوں پر اوندھا دیتا اور لاٹھی گھماتا ہوا بچوں کی طرف دوڑ پڑتا۔اس نے برسوں گھنے جنگلوں اور ویران پہاڑیوں میں ہر قسم کے جانوروں اور پرندوں کی بولیاں سنیں۔شیر،تیندوئے اور چیتوں کے پاؤں کے نشان جانچے پرکھے اور گنتی رجسٹر میں درج کی۔''گھوس کھور'' جیسا بدبودار لفظ اسکے کانوں سے پہلی بار ٹکرایا تو وہ کانپ گیا اور سمجھ گیا کہ جنگلی علاقوں اور دیہاتوں میں یہ شبد پرورش پا گیا تو سرکاری مشنری کے کل پرزے ڈھیلے ہوجائیں گے۔

''کتے۔حرامیوں۔زندہ گاڑ دوں گا''۔

اختر مرزا کے خرّاٹے بند ہوئے۔ کروٹ بدلی اور بڑبڑانے لگا۔

''سور کے بچوں۔ کتے۔ حرامی''۔

اماں بے چین تھی کہ گالیاں بند ہوں تو پنجرہ کے پاس غازی میاں کی چھڑی کھڑی کرے۔ منت مانگے کہ اکبر کا طوطا اسلام پر ایمان لے آئے۔ آدھی رات گذر گئی اور طوطی تو ناکیدار کا ہی بولتا رہا''۔ سور کے بچے۔ کتے۔ حرامی''۔ اماں تنگ آگئی اور خود بھی خراٹے بھرنے لگی۔ سویرے مرغے بولے تو للتا کا مٹھو بھی جاگ اٹھا ۔''سیتارام۔ مٹھو سیتارام'' اختر مرزا کی نیند ٹوٹ گئی۔ وہ پلنگ پر اچھل کر بیٹھ گیا ۔سرہانے اکبر کا مرزا کا مٹھو سینہ پھلائے آنکھیں مٹکا تا ہوا انگارے اچھال رہا تھا۔

''سور کے بچے۔ کتے۔ حرامی''۔

اماں لحاف پھینک ہڑبڑا گئی۔

''اجی۔ یہ سویرے سویرے گالیاں کیوں بک رہے ہو''؟

اختر مرزا نے دس گرام کے گستاخ طوطے کی گز بھر لمبی زبان سے یہ سب سنا اور آپے سے باہر ہو گیا۔ سرکس کے ہاتھی کی طرح اسٹول کو فٹ بال بنا دیا۔ پنجرہ دور جا گرا۔ طوطے کی دردناک ٹرٹراتی چیخ سن بلوں سے گردن باہر نکالے چوہے بھی الٹے پاؤں اندر کھسک لیے۔ اماں کچھ بولتی اس سے پہلی ہی اختر مرزا نے پنجرے کی پھٹکی کھول دی اور طوطا ایسا فرار ہوا جیسے نازی کیمپ سے اتحادی قیدی۔ اتنی سنگین واردات نے اکبر مرزا کو بھی خوفزدہ کر دیا اور پھر کبھی اس نے طوطا پالنے کی ضد نہیں کی۔

اکبر مرزا نے سفید قمیض کو نیلے نیکر میں ٹھونسا، پاؤں میں چپل پہنی اور گردن میں کتاب کاپیوں کا چھوٹا سا بیگ کاندھے پر لٹکائے کچی سڑک پر آ گیا۔ اسکول کا گھنٹہ بجنے میں دیر تھی۔ وہ ہر روز کی طرح للتا پرشاد کی باگڑ کا بانس ہٹا کر چبوترے پر طوطے کے پنجرے کے پاس آ بیٹھا۔ یاقوتی اور نوکیلی چونچ، سرخ چھلے دار گردن دائیں بائیں گھماتے ہوئے طوطے نے آنکھیں جھپکائیں، اسے گھورا اور کھنکتی آواز میں بول اٹھا۔

'' سیتارام۔ مٹھو سیتارام''۔

اکبر مرزا ہتھیلیوں پر ٹھڈی جمائے اسے دیکھتا رہا زبان چڑائی اور آہستہ سے کہا۔

'' چپ ہو جا مٹھو۔ للتا کہاں ہے؟۔ طوطے نے پر پھلائے۔ بازو پھڑ پھڑائے اور رٹی رٹائی بات دہرا دی''۔ '' سیتارام۔ مٹھو۔ سیتارام''

رام پرشاد نیا نیا پنساری کلہاڑی سنبھالے تن تنہا سورج ڈوبنے سے پہلے جنگل میں چلا جاتا اور اندھیرے میں ساگون کی بلّیاں کاٹ کر وہیں چھوڑ آتا۔ صبح کاندھے پر لاد کر اپنی جھونپڑی کے پاس رکھ دیتا۔ مہینے بھر کی کڑی محنت کے بعد ٹھونک ٹھاک کی اور دو کمرے بنا لیے۔ تین طرف سے لکڑیوں سے بند کر لیا اور سڑک والے حصے میں چھپّر ڈال سائبان نکال لیا۔ یہیں اس کی دوکان کھل گئی۔ پانچ سال پہلے تک میلوں رقبے میں پھیلا یہ علاقہ اچھاور تحصیل کے گھنے بیابان جنگلوں کے لئے مشہور تھا شیشم، بیجا، ساج، ہلدو اور کئی قسم کے بلند تناور ہرے بھرے درخت دن میں سورج کی کرنوں کو زمین چاٹنے بھی نہیں دیتے تھے۔ حالت یہ تھی کہ محکمہ جنگلات کے کارندے سروے کرنے بیل گاڑیوں سے اوبڑ کھابڑ پگڈنڈیوں پر آتے تو بارہ سیل کی بیٹریاں ساتھ لاتے۔ آسمان چھوتی پہاڑیوں کے بیچ کولا رندی بہتی تھی اور وہاں سے پیچھے کا دس بارہ کِلو میٹر کا فاصلہ پھلانگتی آگے بیس کلو میٹر دور نربدا ندی میں جا ملتی۔ کولار میں بے شمار پہاڑی نالے بھی گرتے تھے اور تب بارش کے موسم میں دور دور تک چڑھتی ابلتی ندی کی چنگھاڑ اور شیروں کی دہاڑ ہی سنائی دیتی تھی۔

جب اچھاور تحصیل اور ارد گرد کے گاؤں میں خبر پھیلی کہ گرام جھال پلی کے پاس کولا رندی پر مٹی کا بڑا ڈیم بننا شروع ہو گیا ہے۔ اس وقت رام پرشاد سائیکل پر آئس کرم کی پیٹی رکھے قریب کے گاؤں میں بچوں کو لبھا رہا تھا۔ اس کے ان پڑھ دماغ میں مانو دیوالی کے پٹاخے پھوٹ پڑے۔ کچھ دن گذرے تو جون کی چلچلاتی دھوپ میں سائیکل کے کیریئر پر کچھ کپڑے، چادر تکیہ اور آٹا دال کی گٹھری باندھ چل پڑا۔ چھ گھنٹے کا

کٹھن سفر طے کر وہ پسینے میں تر بتر ڈیم سائٹ پر آ پہنچا ۔ساگون کے تنے سے کمر ٹکائی ۔ ڈپٹی رینجر کے دفتر کے باہر پانی کی پیاؤ سے جی بھر پانی پیا۔لمبی ڈکار آئی تو تھکاوٹ سے راحت ملی۔ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کلہاڑی کاندھے پر رکھے وہ ناکے دار کے کمرے پر آیا۔اختر مرزا ناکیدار تخت پر لیٹا ہوا تھا۔چوکیدار ہاتھ میں پنکھا لیے ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں کی بوچھار بکھیر رہا تھا۔

''سلام ناکیدار صاحب'' رام پرشاد تھکی کمر جھکائے اختر مرزا کو تکتا رہا۔کہتے ہیں پٹواری اور ناکیدار سرکاری عمارت کے ایسے دو مضبوط ستون ہوتے ہیں جنکے آنکڑوں پر سرکار کی بڑی کلاک مغلوں کی زمانے سے ٹک ٹک کرتی آئی ہے۔

''بول بھئی ۔کہاں سے آئے ہو؟

''سرکار اچھاور سے آیا ہوں۔رام پرشاد نام ہے۔غریب آدمی ہوں۔ یہاں کام دھندا کروں گا۔'' رام پرشاد کئی برسوں سے آئسکریم کی ٹھنڈی میٹھی آواز سے بچوں کو للچاتا آیا تھا۔جھٹ سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو روپیہ کا اہنسا وادی نوٹ مٹھی میں دابے تخت کے پاس آیا۔جھکتے ہوئے وہ نوٹ اختر مرزا کے گھٹنوں کے پاس یوں رکھ دیا جیسے بھگوان کے چرنوں میں پھول چڑھا رہا ہو۔چوکیدار کے ہاتھوں میں بجلی سی دوڑ گئی۔اتنے زور سے پنکھا گھمایا کہ رستم جیسی طاقت والا کاغذی نوٹ گھٹنے کے پاس سے اڑا اور اختر مرزا کے ننگے پیٹ سے آچپکا۔ہاتھ سے جلتی بیڑی پھینکی اور اس نے پھرتی سے اسے دبوچ خاکی پتلون کی جیب میں ٹھوس لیا۔الہ دین کے جن کے انداز میں بولا۔

''کیا چاہتے ہو؟

''پیپل کے نیچے پچاس گز زمین اور گھر بنانے کو لکڑی۔''

رام پرشاد اپنی پتنی اور اکلوتے لڑکے للتا پرشاد کو اچھاور میں اکیلا چھوڑ کر چلا تھا تو اس نے آنے والے وقت کو مٹھی میں جکڑنے کے لئے کئی راتیں گِنا بھاگ میں جاگتے

گزار دی تھیں۔ بیس کروڑ کا ٹینڈر ہونا تھا۔ کام پر ہزاروں مزدور آئینگے۔ ٹھیکیدار کی مشنری اور اسٹاف کے علاوہ فاریسٹ اور سینچائی محکمہ کا بھاری بھرکم عملہ ہوگا۔ ڈیم مکمل ہونے کے بعد سینچائی کے علاوہ راجدھانی کے لئے پینے کا پانی سپلائی کیا جائے گا تو وہاں مستقل رہنے والے سرکاری کرمچاریوں کی کالونی بھی تعمیر ہوگی۔ تب تک رام پرشاد کی چھوٹی سی دوکان وہاں کا سب سے پرانا کرانہ اسٹور ہو جائے گا۔ دس پانچ میل کے علاقے میں آباد آدیواسی جو پہلے میلوں دور تحصیل سے اپنی ضروریات کا سامان لینے جایا کرتے تھے، ڈیم پر آتے جاتے رہینگے۔ رام پرشاد کے سپنے پورے ہوئے۔ اب کولار ڈیم کا کھاتا پیتا دم دار آسامی تھا اور للتا پرشاد مڈل پاس ہو کر اس کی باقی زندگی کا ساجھے دار بن گیا۔

مڈل پاس کیا تو اختر مرزا نے اپنے بیٹے کو راجدھانی کے ہائی اسکول میں داخل کرا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اکبر مرزا کو جنگل اور اس میں سانس لینے والے جانوروں اور پرندوں سے کتنا پیار اور لگاؤ ہے۔ ڈگری تک تعلیم کے بعد اگر دہرہ دون کے فاریسٹ انسٹیٹیوٹ میں داخلہ ہو گیا تو اکبر مرزا کی زندگی سنور جائے گی۔ گاؤں کے اسکول کی کچی چھت اور پتھر کی فرشی پر آٹھ سال گزارنے کی کڑی مشقت اکبر مرزا کے خون میں رچ بس گئی تھی۔ سردیوں میں اماں کی بنائی ہوئی چھوٹی سی گدّی فرشی پر رکھ لیتا اور بارش گرمی میں اخبار کے پنّے اسے بڑی راحت دیتے۔ پہلے دن شہر جانے کی اکبر مرزا نے اتنی تیاری نہیں کی جتنی ماں نے سویرے سے اٹھ کر شروع کر دی تھی۔ خالص گھی میں تین نرم نرم پراٹھے اور آلو کی قتلیاں ٹفن باکس میں رکھ دیں۔ ٹیریکاٹ کی سفید شرٹ پینٹ سلیقہ سے کھونٹی پر ٹانگی۔ نہانے کے لئے پانی گرم کیا اور جانماز بچھا سجدے میں سر ٹیک دیا۔ گڑگڑاتے ہوئے گاؤں بھر کی ممتاؤں کی زبان اپنے منہ میں سمیٹ لیں۔ جتنی دعائیں یاد آتی گئیں مانگیں اور آہستہ سے اختر مرزا کی پائنتی پر آ بیٹھی۔ ہولے ہولے اس کے پاؤں دابتے ہوئے بولی۔

''اجی اٹھیئے ۔ چھ بج گئے ۔ اکبر کو اسکول جانا ہے ۔بس میں بٹھا آیئے ۔'' اختر مرزا نے کروٹ بدلی اور جھنجھلا کر بُد بُدایا۔

''چلا جائے گا۔ کنڈکٹر کو سمجھا دیا ہے۔کوئی فکر مت کرو۔'' اکبر مرزا نہایا دھویا اور کپڑے پہنے، بیگ لٹکائے باہر آگیا۔اس کے قدم سیدھے للتا پرشاد کے گھر کی طرف اٹھ گئے ۔سینہ تانے طوطے کے پنجرے میں جھانک کر بولا۔

''مٹھو چتر کوٹی ۔شہر کے اسکول جارہا ہوں۔''

طوطا ہمیشہ کی طرح کہہ اٹھا۔

''سیتا رام ۔مٹھو سیتا رام۔'' رام پرشاد، اس کی پتنی اور للتا پرشاد کمرے سے باہر نکل آئے۔

''تو جارہے ہو شہر؟

''ہاں چاچا۔للتا کو بھی جانے دونا۔''

''پورے کنبے میں اکیلا مڈل پاس ہے للتا۔ ہمارے ہاں اتنا ہی بہت ہوتا ہے۔ جاؤ بیٹے ۔اچھا ہے بڑے افسر بنو۔''

للتا اس کے ساتھ بس اسٹاف تک آیا۔راستے بھر چھوٹے بڑے سب ہی اکبر مرزا کو آنکھیں پھاڑے یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ شہر کے اسکول نہیں دلّی کی پریڈ میں جا رہا ہو۔

''تُو دن بھر یاد آئے گا للتا۔ مجھے بھولے گا تو نہیں؟

''شام کو تو آجاؤ گا۔ بھولنا کیسا۔'' صبح سات بجے کی بس ڈیم سے چلتی اور اکبر مرزا نو بجے اسکول پہنچ جاتا۔نویں کلاس میں لکڑی کی پرانی ہلتی ڈولتی کرسی اور لوہے کی کیلوں سے کانپتی میز کو حیرت سے دیکھتے ہوئے پہلے دن جوتے پہنے کرسی پر جیسے ہی بیٹھا، کرسی کی دو ٹانگیں پولیو کے بچے کی طرح غلیل کی تنی ہوئی ربر بن گئیں اور وہ بھد سے فرش پر گر پڑا۔شام کو چار بجے کی بس سے اکبر مرزا گھر لوٹا اور پلنگ پر کاپی کتابیں

پھینک باہر کو دوڑ پڑا۔ اماں آواز دیتی رہی اور وہ ان سنی کرتا سیدھا للتا پرشاد کی دوکان پر آدھمکا۔ بڑے مزے سے پہلے دن کی ساری باتیں پٹا پٹ سناتا گیا اور للتا پرشاد کی آنکھیں اچنبھے سے یوں پھیل گئیں مانو مہابھارت کی کوئی کہانی سن رہا ہو۔

''ہائے رام۔ تم میز کرسی پر بیٹھے تھے؟ بہت بڑا اسکول ہے تمہارا؟

''ہاں للتا اپنے گاؤں کے اسکول برابر تو ایک کمرہ ہے!۔

کانچ لگی کھڑکیاں ہیں۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے گورے

گورے لڑکے ہیں۔ کھیل کا بہت بڑا امیدان ہے!''

''یار اکبر تو تو بڑا صاحب بن جائے گا!''

للتا نے حسرت سے اکبر مرزا کو دیکھا اور گڑ سے مکھیاں اڑانے میں مصروف ہو گیا۔ چار سال یونہی گزر گئے۔ اکبر مرزا کہتا رہتا اور للتا پرشاد حیرت سے اس کا منہ تکتا رہتا۔ اکبر مرزا نے بارھویں کا امتحان پاس کیا تو للتا پرشاد نے اپنے دوستوں کو خوب ساری میٹھی گولیاں بانٹیں اور دیر رات تک ڈیم پر گھومتے رہے۔ ڈیم اور گاؤں والوں نے یہ تماشہ ایسے ہی دیکھا جیسے وہ ہر سال رام لیلا کی نوٹنکی کا مزہ لوٹتے تھے۔ ہنستے مسکراتے بیڑی کے کش لگاتے اور اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔

بیس سال جنگلوں میں ناکیداری کرنے کے بعد اختر مرزا ناکیدار کو کچھوا چال سے ڈپٹی رینجر کی پوسٹ پر ترقی ملی اور پوسٹنگ شہر میں ہوگئی۔ دیہاتی فضا، دھول گوبر سے بھری سکڑی پگڈنڈیوں اور گٹی کی سڑکوں سے اکبر مرزا جگمگاتے شہر میں تو آگیا مگر اس کے انگ انگ میں کولار ڈیم کی شور مچاتی موجیں، آنکھوں میں لہلاتی فصلیں، آندھی طوفان میں اٹھکیلیاں کرتے اونچے اونچے درخت اور کانوں میں رس انڈیلتی للتا کے طوطے کی آواز سوتے جاگتے اسے بے چین بنائے رکھتی۔ رام پرشاد عمر کی کئی منزلیں طے کر چکا تھا۔ دوکان کا سارا بوجھ اب للتا پرشاد کے کاندھوں پر آگیا۔ شہر سے سامان لانے کی ذمہ داری بھی تھی۔ اکبر مرزا کے ڈیم چھوڑتے وقت اس نے وعدہ کیا تھا کہ

شہر آئے گا اور اسکے ہی گھر میں رُکے گا۔

''سچا وعدہ کر رہے ہو للتا؟

''ہاں ماں قسم نبھاؤ گا!''

''نہیں بالکل نہیں۔ وہی کہو جو تمہارا مٹھو کہتا ہے!

''اچھا بھائی۔ سیتارام۔ سیتارام۔ میں تمہیں کبھی بھی۔ جیون بھر نہیں بھولونگا!''

بی۔ ایس۔ سی میں داخلہ لینا اس کے باپ کی مرضی تھی جو اکبر مرزا کو فاریسٹ میں بڑا افسر بنانے کا سپنا دیکھ رہا تھا۔ کالج میں خالی پیریڈ میں لائبریری میں جا بیٹھتا اور زولوجی کی ولائتی کتابیں دل لگا کر پڑھتا۔ جن میں طوطے کی عادتوں اور خصلتوں کے بارے میں بڑی دلچسپ اور انوکھی باتیں ہوتیں اور وہ خاص طور سے نوٹ بک میں لکھ لیتا۔ اکبر مرزا نے ایک کتاب میں پڑھا کہ پرندوں میں طوطا واحد ایسا پرندہ ہے جو جھوٹ نہیں بولتا۔ جو دیکھتا ہے سنتا ہے وہی کہتا ہے۔! اس نے لائبریری سے ایک موٹی کتاب ایشو کرائی اور گھر میں رکھ لی کہ اتوار کو للتا پرشاد آئے گا تو وہ اُسے پڑھ کر سنائے گا۔

''دیکھ دیکھ کیسی مزیدار کہانی ہے۔ سنے گا؟

''ضرور۔! للتا پرشاد غور سے رنگین تصویروں کو جھانکتے ہوئے تیز آواز میں بولا ''یار اکبر تم نے اتنی انگریزی پڑھ لی؟

''چل چھوڑ سن۔ انگلینڈ کا بادشاہ ہنری ششم نے ایک طوطا پال رکھا تھا۔ یا قوتی چونچ۔ بڑا ہوشیار اور باتونی۔ ایک دن محل کی کھڑکی سے پنجرہ نیچے ندی میں جا گرا۔ طوطا زور زور سے چلاّنے لگا۔ ''کشتی۔ کشتی بیس پاؤنڈ''۔ وہاں کئی مچھیرے کشتیاں لئے گھوم رہے تھے۔ طوطے کی فریاد سنی تو اُدھر آگئے اور پنجرے کو نکال کر اس کی جان بچالی۔ بادشاہ نے مچھیروں کو بیس پاؤنڈ انعام میں دیئے۔ اور للتا تجھے معلوم ہے طوطا پچیس سال جیتا ہے۔''۔۔۔۔۔ للتا تعجب سے اکبر مرزا کو گھورتا رہا تھا مانو اس نے کسی

دیوتا کا چمتکار دیکھ لیا۔

'تو میرا مٹھو پچیس سال زندہ رہے گا۔! ہائے رام۔ تب تک تو پتا جی کی کمر ہی جھک جائیگی!

''اور سن۔ طوطا کبھی جھوٹ نہیں بولتا للتا!!

''بتاؤ تو بھلا!۔ لوگ باگ تو عدالت میں گیتا قرآن ہاتھ میں اٹھا کر جھوٹ بول دیتے ہیں۔ رام۔ رام۔''

دونوں دو سال تک یونہی بیٹھتے اور بھاری بھاری کتابوں میں چھپے بیٹھے جانوروں پرندوں کی داستانیں پڑھتے سنتے۔ دانتوں میں انگلیاں دبا لیتے اور پھر کسی مولوی پنڈت کے انداز میں کہتے کہ کاش انسان اپنی برتری اور قوت کے گھمنڈ کو بھول جائے اور ان بے زبان جانوروں کی اپنی ہی طرح جینے دے۔ خوش رنگ دل لبھانے والے پرندوں کو اپنا دوست اپنا میت بنا لے۔!

دسمبر کی کڑکتی ایک شام للتا پرشاد پنجرے پر موٹا کپڑا باندھے مٹھو چتر کوٹی کو لئے آدھمکا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ہینڈ بیگ تھا اور وہ گرم کپڑے پہنے تھا۔ سر پر اونی ٹوپی اور گلے میں زعفرانی مفلر لپٹا تھا۔ ابا اور اماں چھوٹے ماموں کی شادی میں شریک ہونے لکھنو گئے ہوئے تھے۔ اکبر مرزا فروری میں ہونے والے سالانہ امتحان کی وجہ سے گھر پر تھا۔ للتا پرشاد کو معہ ساز و سامان دیکھتے ہی بول اٹھا۔

''ارے للتا تم؟۔ سب ٹھیک ہے نا۔! یہ مٹھو کو کیسے لے آئے؟

''اندر چلو بتاتا ہوں!''

للتا پرشاد نے پنجرہ فرش پر ایک کونے میں رکھ دیا اور بیٹھتے ہوئے بولا۔

''دو دن سے مٹھو خاموش ہے کچھ بھی نہیں بولتا۔ گم سم بیٹھا آنکھیں ادھر ادھر گھماتا ہے''!

''تم آرام کرو۔ میں ہوٹل سے ٹفن لے آتا ہوں۔ کل تمہارے مٹھو کو

ویٹری ہاسپٹل میں ڈاکٹر کو دکھا دینگے''!

''نہیں اکبر میں وہاں ہو آیا۔ چار بجے ڈیم سے آ گیا تھا!

''کیا کہا ڈاکٹر نے؟

''وہ کہتا ہے طوطے کو کوئی بیماری نہیں۔ یہ کسی چیز سے ڈر گیا ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا!''

''اچھا کھانا تو کھالو۔ میں بھی کھاؤں گا۔ پتا جی اور ماتا جی کیسے ہیں؟

''سب اچھے ہیں۔ تمہیں یاد کرتے ہیں۔ میں نے کھانا کھا لیا ہے اور میں رات کو لکھنؤ جا رہا ہوں!''

''کیوں وہاں کیا کام آن پڑا؟

''ایودھیا جاؤں گا رام للہ کے درشن کرنے''

جس رات للتا پرشاد لکھنؤ والی ٹرین میں سوار ہوا اس کے دوسرے دن اکبر مرزا ہوٹل یا۔ سڑکوں پر آتے جاتے لوگوں میں ایسا جوش وخروش پایا جو پہلے کبھی اس نے نہیں دیکھا تھا۔ جگہ جگہ ٹولیوں میں زور زور سے چرچا چل رہی تھی۔ سب سے انوکھی اور عجب بات اس نے محسوس کی کہ اکثریت ایسے افراد کی تھی جو ہو بہو کولا رڈیم کے دیہاتی اور آدی باسی نظر آرہے تھے۔ وہی ویش بھوشا اور ویسے ہی چہرے مہرے۔ وہ سمجھا شاید ضلع ہیڈ کوارٹر میں آدیباسیوں کا سمیلن ہو رہا ہوگا۔ اسنے بڑے غور سے کئی آنکھوں میں جھانکا جن میں ان جنگلی کتوں جیسی آب وتاب تھی جو کسی نہتے چوپائے کو گھیرتے اور جھپٹتے وقت جھلکتی ہے۔ ایک بار للتا پرشاد اور اکبر مرزا کولا رندی کے کنارے دور دور تک گھومتے چلے گئے۔ للتا کی خوبی تھی کہ وہ جنگل میں کسی بھی خطرہ کی بُو سونگھ لیا کرتا تھا۔ اچانک وہ ٹھٹک کر رُک گیا اور بولا۔

''جلدی کرو۔ وہ۔ وہ۔ سال کے درخت پہ چڑھ جائیں۔ آؤ تیزی سے''

اُسنے اکبر مرزا کا ہاتھ پکڑا اور دونوں بندروں کی طرح درخت کی اونچی شاخ

پر بیٹھ گئے۔ کچھ منٹ بعد ایک سانبھر تیز رفتار سے بھاگتا ادھر ہی کو آیا۔ اسکے پیچھے سونی کتے لگے ہوئے تھے۔ کئی تو اچھل اچھل کر سانبھر کی پچھلی ٹانگوں کو لہولہان کر چکے تھے۔ موت اور زندگی کی بھاگ دوڑ دونوں نے پہلی بار دیکھی۔ اڑتا گرد و غبار کم ہوا وہ نیچے اترے اور سرپٹ ڈیم کی طرف دوڑ چلے۔

اس نے جھٹ پٹ ٹفن بھروایا اور اپنے کھاتے میں پیسے کاؤنٹر پر لکھوانے لگا تو ہوٹل مالک نے سرگوشی میں کہا۔

''میاں روٹی زیادہ رکھ لو۔ کام آئیگی''

اکبر مرزا کچھ سمجھ نہیں پایا اور تیز قدموں سے گھر کی طرف ہولیا۔ دروازہ کا تالا کھولتے وقت اس کی نگاہیں سفید چاک سے بنے کراس پر جم گئیں۔ اس کا مکان محلّہ کی تنگ گلی میں پہلا تھا۔ سوچا کسی بچے نے بنا دیا ہوگا۔ شام کے سات بجے تک اکبر مرزا اخبار کا سنڈے میگزین پلٹتا رہا۔ بچوں کی مزیدار کہانیاں پڑھنے کی لت اسے ہائی اسکول میں پڑگئی تھی۔ حاتم طائی اور الہ دین جیسی داستانیں اسے بہت پسند تھیں۔ یکایک وہ اچھل پڑا اسکی آنکھیں خوشی میں چمک اٹھیں۔ پورے صفحہ پر رنگین تصویروں کے ساتھ علی بابا چالس چور کا قصہ چھپا ہوا تھا۔ اکبر مرزا چھوٹا بچہ نہیں تھا۔ اٹھارہ سال کا ہٹا کٹا نوجوان۔ کالج لائبریری سے لائی ہوئی کتابیں پڑھنے والا۔ دسمبر کی برفیلی رات میں دادی کے لاڈلے پوتے کی طرح لحاف میں گھس کر علی بابا میں کھو گیا۔ گھنٹہ بھر میں ہم ہم کا جادو مرجینا کی باوفا چالاکی اور چالیس چوروں کے سردار کا انتقامی جذبہ اکبر مرزا کے خون میں مسی بر گیا۔ کہانی پوری ہوئی اور دماغ میں سوئیاں سی چُبھنے لگیں۔ دروازہ پر کراس کا نشان نہ جانے کیوں خوف اور دہشت کے کالے پردے جیسا اکبر مرزا کی آنکھوں کے سامنے ہلنے ڈولنے لگا۔ اس کا دل مانو کسی بندر کی طرح اونچے درختوں پر قلابازیاں لگا رہا ہو۔ حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ سارا جسم پسینہ میں نہا گیا۔ گھبرا کر اسنے لحاف اتار پھینکا اور دوسرے کمرہ میں طوطے کے پنجرے کے پاس آ بیٹھا۔ تین

کمروں کے مکان کی ہیبتناک تنہائی میں یہی معصوم پرندہ اس کی انجانی وحشت کا ساتھی تھا۔اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

''مٹھو چتر کوٹی۔کھاؤ دودھ روٹی۔''

''بول بھائی۔کچھ تو بولو۔منہ تو کھولو۔

للتا پرشاد کی یاد نہیں آتی؟

مٹھو کی آنکھیں ستاروں جیسی اٹھکیلیاں کرتی رہیں۔کھُلتیں اور پلک جھپکتے ہی بند ہو جاتیں۔آدھے گھنٹے تک اکبر مرزا یونہی مٹھو کو اپنے ڈر کا حصہ دار بنانے کی کوشش کرتا رہا لیکن مٹھو کسی بھی قیمت پر اپنا ''مون برت'' توڑنے کو راضی نہیں ہوا۔وہ اکتا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔بھوک مٹ چکی تھی۔ٹفن اٹھا کر کچن میں رکھ آیا اور پلنگ پر آتے ہی لحاف اوڑھ لیا۔اتنی ٹھنڈ پہلے کبھی نہیں لگی تھی۔اسے ابا اور اماں کی بے تحاشا یاد آنے لگی۔اس نے اخبارات دور پھینکے اور دو دن پہلے کالج لائبریری سے لائی ہوئی کتاب سائڈ ٹیبل سے اٹھالی۔جنوبی امریکہ کے آمیزن طوطے اور افریقہ میں پائے جانے والے بھورے رنگ کے طوطوں کی تصویریں دیکھیں اور ان پر نوٹس پڑھنے لگا۔اسے حیرت ہوئی کہ طوطا درختوں پر اڑنے کے بجائے نیچے سے اوپر چڑھنا پسند کرتا ہے۔اور اسے رات کا اندھیرا بہت مرغوب ہوتا ہے۔رات کو روشنی اتنی ناگوار ہوتی ہے کہ وہ چلاّنا شروع کر دیتا ہے۔طوطے کی سب سے اہم صفت کتاب میں یہ لکھی تھی کہ وہ نہایت فرمانبردار اور اطاعت گزار چڑیا ہے۔پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھیں تھک گئیں اور وہ گہری نیند میں ڈوب گیا۔

رات کافی بیت چکی تھی۔نہ جانے کب اکبر مرزا نے کروٹ بدلی اور وہ جاگ اٹھا۔اسے احساس ہوا باہر گلی میں دبے دبے قدموں کی دھمک اور اژدہے جیسی پھنکار گونج رہی ہو۔اس کے کانوں میں مدھم سی آوازیں دستک دینے لگیں معلوم ہوتا تھا دھرتی کے نیچے زلزلہ کی لہریں کروٹ لے رہی ہوں۔لحاف کی روئی تندور کی طرح گرم

محسوس ہوئی اور وہ پلنگ سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ سر سے پیر تک تھرتھری دوڑ گئی۔ ڈر کے مارے آنسو بہہ نکلے۔ وہ کاغذ کی ناؤ جیسے ڈولنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا چالیس چوروں نے اس کا مکان پہچان لیا ہے۔ اکبر مرزا دبے اور کانپتے قدموں سے اس کمرہ میں آیا جہاں مٹھو چتر کوٹی کا پنجرہ رکھا ہوا تھا۔ اس نے کمرہ کی لائٹ جلا دی اور کلائی کی گھڑی دیکھی۔ چار بج رہے تھے اور تب ہی کمرہ میں بھونچال آ گیا۔ طوطے نے مون برت توڑ دیا۔ وہ گلا پھاڑ کے چیخ رہا تھا۔

''سیتارام۔ مٹھو سیتارام''

''سیتارام۔ مٹھو سیتارام''

للتا پرشاد کا مٹھو ولایتی کتابوں کے اوراق اور شاہ ہنری کے طوطے کی خود غرضی کا گلا گھونٹ چکا تھا۔ اکبر مرزا نے محسوس کیا گلی میں غیض و غضب سے زمین کی چھاتی کوٹتے بھاری جوتوں کی خوفناک آواز آہستہ آہستہ ڈوبتی گئی۔ دور جاتے غصیلے لوگ کہہ رہے تھے۔

''یہ تو اپنوں کا گھر ہے۔ چلو آگے بڑھیں!

☆☆☆

فتح قریب ہے

سلمیٰ سلطان پیتل کی تھالی تھامے آٹو سے اتری اور تیز تیز قدموں سے ٹھاکر حویلی کے وسیع دالان میں آ گئی۔ تھالی پر سبز رنگ کے مخمل کا خوان پوش تھا۔ تخت پر گاؤ تکیے سے کمر ٹکائے بڑے ٹھاکر رام سنگھ اٹھ بیٹھے تھے۔ ان کا بڑا بیٹا کنور لکشمن سنگھ کرسی چھوڑ کر سلمیٰ کی طرف بڑھا۔ لیکن اس کی پتنی سرلا ہمیشہ کی طرح نتھنے پھلائے بیٹھی رہی۔ سلمیٰ نے تھالی تپائی پر رکھ دی اور بڑے ٹھاکر کو آداب بجالائی انکا سیدھا ہاتھ سلمیٰ کے سر پر چند پل کو رکا۔ وہ برسوں سے یونہی اپنے بچپن کے دوست عبید اللہ خاں کی چہیتی بیٹی کو آشیرواد دیتے آئے تھے۔

''جگ جگ جیو بیٹی۔ کیسی ہو؟ کب آئیں سسرال سے؟''

''پرسوں آئی بابو جی۔ ماموں بہت بیمار ہیں''

سلمیٰ نے تھالی سے کپڑا ہٹایا۔ سب کی نظریں سنہری راکھی، مٹھائی، ناریل اور آسمانی رنگ کے رومال کی طرف اٹھیں لیکن سرلا ٹکٹکی باندھے دیوار پر بیٹھی چھپکلی کو دیکھتی رہی۔ لکشمن سنگھ نے مسکراتے ہوئے اپنی چوڑی کلائی سلمیٰ کے آگے بڑھا دی۔ سرلا کو پتہ نہیں تھا کہ یہ رکشا بندھن کا سلسلہ کب سے جاری تھا۔ دو سال پہلے سلمیٰ کی شادی کے موقع پر ہم جولیوں سے معلوم ہوا کہ سلمیٰ دس سال کی تھی تب اس کے چھوٹے

بھائی یوسف کی چیچک کی وبا میں موت ہوگئی تھی ۔ بھائی کو کھو کر سلمیٰ نیم دیوانی ہوگئی ۔ ایک ہی بھائی تھا ۔ اس کے والد عبید اللہ خاں فوج میں ٹھاکر رام سنگھ کے ساتھی تھے ۔ ایک ہی رجمینٹ میں کرنل کے عہدے پر رہے ۔ 1939 کی جنگ میں شانے سے شانہ ملا کر افریقہ کے فرنٹ پر رہے ۔ بہادری دکھائی اور تمغوں سے سینہ آراستہ ہوگیا ۔ ٹھاکر حویلی سے دس قدم آگے دومنزلہ مکان جس میں تنوانی ٹھیکیدار رہتا ہے ۔ اسی میں عبید اللہ خاں رہتے تھے ۔ لکشمن سنگھ ، یوسف اور سلمیٰ کا ایک پاؤں وہاں اور دوسرا ٹھاکر حویلی میں رہتا تھا ۔ ان کی عمروں میں دو دو تین تین سال کا فرق تھا ۔ تینوں میں بڑی دوستی تھی یوسف کا غم دور کرنے میں لکشمن سنگھ کا اہم کردار رہا ۔ وہ خان پریوار کے رِستے زخم پر مسکراہٹوں اور کھلنڈرے پن کا پھایہ رکھتا تھا ۔ اسی دوران ایک دن سلمیٰ نے آنسو پونچھتے ہوئے لکشمن سنگھ کی کلائی میں یوسف کا رومال باندھ دیا ۔ آسمانی رنگ کے رومال پر سلمیٰ نے کشیدہ کاری سے سرخ گلاب کا پھول بنایا تھا ۔ اس نے سوچا تھا عید کے دن یوسف کو دے دیگی ۔ لیکن یوسف عید کا چاند بھی نہ دیکھ پایا ۔

سرلا کا تعلق دقیانوسی رسم و رواج اور خیالات کے کٹر پنتھی راجپوت گھرانے سے تھا ۔ اس کا باپ ویر ساورکر کی ہندو مہا سبھا کا سرگرم ممبر رہا اور قدم قدم پر جناح اور مسلم لیگ کے خلاف جوشیلے نعرے لگا تا رہا تھا ۔ سلمیٰ اور راکھی کا نظارہ پہلی بار دیکھا تو سرلا کو سب کچھ عجب سے لگا ۔ ایسا بُرا منہ بنایا جیسے مکھی مُنہ میں گھس گئی ہو ۔ رات کو کمرے میں سرلا نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے راکھی کو غور سے دیکھا اور اس کی تیوریاں چڑھ گئیں ۔ لکشمن سنگھ سے پوچھا ۔

''یہ کیسی راکھی ہے؟ اس میں تاج محل کی تصویر کیوں ہے؟''

لکشمن سنگھ کو اس تیکھے سوال سے ناگواری ہوئی۔

''کون سا غضب ہو گیا۔ تاج محل محبت کی عجوبہ یادگار ہے۔ ساری دنیا

اسے دیکھنے کو اُمڈی آتی ہے۔''

سرلا تنک کر بولی۔

''واہ! کیا کہنے۔ تاج محل پتی پتنی کی یادگار ہے۔ بھائی بہن کے پوِتر رشتے

سے اس کا کیا لینا دینا؟

لکشمن سنگھ کو غصہ آ گیا۔ تڑپ کر کہا۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو''

''مجھے یہ چونچلے اچھے نہیں لگتے''

سرلا مسہری پر لیٹ گئی اور چادر سے منہ ڈھاپ لیا۔

اپنی شادی کے بعد سلمیٰ ایک بار ہی لکشمن سنگھ کو راکھی باندھ سکی اس کے بعد ملک کا بٹوارہ ہو گیا۔ کرنل عبیداللہ خاں پاکستان کی فوج میں گئے تو ایسے گئے کہ باپ دادا کا مکان اور ان کی ہڈیاں بھی چھوڑ گئے۔ ٹھاکر رام سنگھ کی پسلیاں تڑک اٹھیں۔ لکشمن سنگھ آنسوؤں پر قابو نہ پا سکا۔ جاتے وقت کرنل عبیداللہ خاں نے چھوٹا سا ٹین کا ڈبہ بڑے ٹھاکر کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا تھا۔

''ٹھاکر اسے سنبھال کے رکھنا۔ اس نے افریقہ کے فرنٹ پر ہماری

حفاظت کی تھی۔ یہ دوستی اور جنگ میں فتح کی انمول یادگار ہے''۔

وقت اپنی رفتار سے بھاگتا رہا۔ ہندو پاک کے کھٹے میٹھے رشتوں کے درمیان قرابتوں کی وہ تصویروں بھی دھندلا گئیں جن کے دلکش رنگ آنکھوں کو ٹھنڈک

پہنچاتے تھے۔ بڑے ٹھاکر کی چِتا جلے کتنا سمئے گذر گیا پتہ ہی نہ چلا۔ لکشمن سنگھ کو بعد میں معلوم ہوا کہ سلمٰی اور اس کے سسرال والے بھی رام پور سے سرحد پار چلے گئے۔ دو سال گذرے تھے کہ بھاولپور سے سلمٰی کا لکشمن سنگھ کے نام خط آیا۔ جس میں لکھا تھا کہ پاپا کشمیر پر حملے کے دوران ہلاک ہو گئے۔

لکشمن سنگھ نے چائے کی پیالی اٹھائی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ ہونٹ کچھ زیادہ اوپر اٹھ گئے ہیں۔ کلائی کپ اٹھانے میں لرز رہی تھی۔ اسے اپنے بازوؤں پر ہمیشہ بھروسہ رہا مگر بھول گیا کہ وہ اب بوڑھا ہو چکا ہے۔ 1971 کی جنگ میں مگر مچھ کی نوکیلی کھال سی پہاڑیوں پر کہنیوں کے بل کوئی سو گز تک گھسٹتا گیا اور روڑے، کنکر قالین کے پھول سے لگے۔ اب اس کا ہاتھ امرود کی کمزور ٹہنی کی طرح کانپا۔ تو سمجھ میں آیا، داہنی آنکھ کا موتیا بند پکنے کو ہے۔ کچھ دیر بعد یقین ہو گیا۔

''اچھا یاد آیا سرلا۔ آج میری برتھ ڈے ہے''

''جی ہاں۔ ایشور کی کرپا سے اسّی سال کے ہو گئے۔''

''ہاں بھاگیہ وان۔'' کپ ہاتھ میں ڈول رہا تھا۔ لکشمن سنگھ نے اُداسی سے سر جھکا لیا۔ اسکول کے دنوں میں اسّی پنّے کی کاپی پر حساب کا سوال غلط ہو جاتا۔ ڈر کے مارے وہ پنّا پھاڑ دیتا۔ سوال کبھی بھی صحیح نہیں ہوتا۔ پنّے پھٹتے رہتے جس کی اس نے گنتی بھی نہیں کی۔ سرلا نے اسّی برس یاد دلایا تو ٹھٹھک کے سوچنے لگا۔

''میں بھول گیا۔ مگر کیوں بھول گیا۔ جیون کی کاپی میں بس گتّا ہی گتّا بچا ہے''۔

چائے ٹھنڈی ہو گئی لیکن لکشمن سنگھ کپ اٹھانے کی ہمت نہیں جٹا پایا اور سرلا سے بولا۔

''وہ میرا چمڑے کا ہینڈ بیگ اٹھالاؤ''

''اسے تو چوہے کُتر کُتر ادھ مرا کر گئے۔ نہ جانے کہاں رکھ دیا۔ کیا دیکھنا ہے اس میں؟

''اس بیگ میں ٹھاکر پاپا کے میڈلس کا ڈبہ تھا''۔

''ہاں ہاں وہی ٹین کا''

''وہی بھاگیہ وان وہی۔ کہاں رکھ دیا؟''

سرلا نے دائیں بائیں چوکنا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا بہو آس پاس نہ ہو۔ پھر آہستہ آہستہ سے کہنے لگی۔

''پورا ڈبہ میں نے رسوئی کے چولہے تلے گاڑ دیا تھا''۔

''پاگل ہوگئیں۔ اس میں ٹھاکر پاپا کی امانت ہے۔ میری آتما ہے۔ وہ تو گل سڑ گیا ہوگا''

سرلا نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''لو جی آپ بھی سٹھیا گئے۔ دس سال سے مہیندر کی بہو گیس کے چولہے پر کھانا پکا رہی ہے''

''ہائے رام! میں بھول گیا۔ یاد آیا تم نے کہا تھا کہ لکڑی کے دھوئیں سے بہو کی آنکھیں پھوٹی جا رہی ہیں''

چار سال کی بیوگی اور بیماری سے سرلا تنگ آگئی۔ ادھر بہو کا گھڑی گھڑی مہنگائی کا رونا، دال کے بھاؤ آسمان چڑھ گئے۔ پیاز آٹھ آٹھ آنسو رُلاتی ہے۔ سبزی بھاجی جیب پر بھاری ہوگئی۔ دواؤں پر کوئی کنٹرول نہیں۔ ماتھے کی بندیا برابر دوا کی گولی پانچ

روپیہ کی۔ دن میں تین گولیاں اور ہر مہینے خون کی جانچ کے پچاس روپیہ۔ شکر کی بیماری بڑی جاں لیوا ہو گئی ہے۔

''ماں جی میں تو سمئے سے پہلے بوڑھی ہوئی جاتی ہوں۔ ادھر روز روز دوائیں لاتے ان کی بھی سانس پھولنے لگی ہے''۔

سرلا کی جمع پونجی کو دیمک چاٹنے لگی۔ اسے اس کا ذرا بھی دکھ نہ تھا۔ مگر بہو کا سارے دن اٹھتے بیٹھتے شکر کی بیماری کی رٹ اور دواؤں کے خرچ کا بکھان کرنے سے اس کے کانوں میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اس کا من بجھتا گیا۔

''بہو۔ شہر بہت بڑا ہو گیا۔ ہر وقت موٹر کے ہارن اور گلی گلی میں موٹر سائیکلوں سے پھٹ پھٹ سے مجھے ہول ہونے لگا ہے''

مہیندر بڑا بیٹا تھا۔ اسی بات سے خوش تھا کہ ٹھاکر کی حویلی لکشمن سنگھ نے اس کے نام کر دی تھی۔ رہ گئی کھیتی کی چالیس ایکڑ زمین اور گاؤں کا چھوٹا سا مکان۔ اس پر چھوٹا بھائی منوہر تسلی پا گیا۔ وہ شروع ہی سے کھیتی باڑی پر جان دیتا تھا۔ ہائر سیکنڈری میں فیل ہوا تو پھر پلٹ کر شہر میں نہیں آیا۔

''بہو یہاں کی ہوا راس نہیں آ رہی۔ سوچتی ہوں کچھ دن منوہر کے پاس گذار لوں''۔

بہو دل ہی دل میں خوشی سے ناچ اٹھی۔ مانو کانوں میں گھنگرو بجنے لگے۔ قریب آئی اور ساس کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ آہستہ آہستہ پاؤں دباتے ہوئے بولی۔

''ماں جی آپ کی مرضی جو بھی ہو۔ ویسے دونوں گھر آپ ہی کے ہیں۔ جہاں دل چاہے خوشی خوشی رہیے''۔

وہ دیر تک سرلا سے چکنی چپڑی باتوں میں الجھی رہی۔ راج اور شام کی بیچینی بتائی۔ پوتے ہیں۔ دادی دادی کہتے نہیں تھکتے۔ ہر وقت یاد کرتے رہیں گے۔ گھر سونا ہو جائیگا۔

''ماں جی جلدی لوٹ آنا۔ دوا پابندی سے لیتی رہیے گا''

دوپہر میں راج اور شام اسکول سے آئے۔ انھیں سکھا پڑھا کے بہو نے دادی کے کمرے میں بھیجا اور خود دروازے کے پاس کان لگائے سنتی رہی۔

''دادی میں فوج میں جاؤں گا''

''دادا بڑے بہادر تھے۔ جرمن سپاہیوں پر خوب گولیاں چلاتے تھے''

''ہاں ہاں بیٹے'' سرلا نے دونوں کو سینے سے لپٹا لیا۔

''تمھارے پردادا کو انگریز سرکار نے ڈھیر سارے تمغے دیے تھے''

سرلا انھیں لکشمن سنگھ کی دلیری کے کارنامے سناتے تھک گئی۔ اسے نیند آنے لگی اور پوتے ضد کرتے رہے کہ بڑے دادا کے تمغے ایک بار ان کے گلے میں پہنا دیں۔

''دادی کہاں ہیں ہمیں دِکھادو نا''۔

سرلا پر غنودگی حاوی ہو رہی تھی۔ اسی عالم میں کہہ گئی۔

''بیٹا وہ تو برسوں پہلے چولہے میں دبا دیئے تھے''۔

اتنا سُنا تو بہو غصے میں اندر آئی۔ راج اور شام کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''کیوں دادی کو پریشان کر رہے ہو۔ جاؤ باہر کھیلو۔ ماں جی
آپ آرام سے سو جائیں۔''

مہندر شام کو دفتر سے آیا تو ماں کا سوٹ کیس دالان میں تخت پر رکھے دیکھا۔ پوچھ تاچھ کی۔ تبھی سرلا خود بول پڑی۔ مجھے منوہر کی یاد آتی ہے سات بجے کی بس میں بٹھا دے بیٹا مہینے بھر رہ کر لوٹ آؤں گی''۔ ہاتھ منہ دھو کر مہندر سرلا کے پاس لوٹ آیا

''جو حکم ماں جی۔ چلیے''۔

مہندر نے سوٹ کیس اٹھایا اور بہو بچوں نے سرلا کے پاؤں چھوئے۔ جلدی لوٹ آنے کی بات بار بار کہی۔ مہندر گھنٹے بھر بعد بس اسٹینڈ سے واپس آیا تو حیران رہ گیا اس کی بیوی پرانے کچن میں کدالی سنبھالے، پسینے میں نہائے ہانپ رہی تھی۔

''رام رام ماں چولہا توڑ دیا۔ یہ کیا غضب کرتی ہو''

مہندر کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ وہ آج تک گرم گرم روٹیوں کو بھول نہیں پایا تھا۔ وہ اور منوہر کچن میں آ بیٹھتے اور سرلا چولھے پر توا رکھ دیتی۔

ماں بھوک لگی ہے کی فریاد۔ چولہے میں لگی لکڑیوں میں آگ کو اور بھڑکا دیتی۔ شعلے اٹھنے لگتے۔ سرلا کٹوریوں میں دال اتارتی اور تھالی میں رکھ دیتی۔ تیزی سے لوئی چکوٹی پر بیلتی اور ہتھیلیوں پر پٹا پھٹ کر توے پر بچھا دیتی۔ خالص گھی میں چپڑی ایسی تازہ اور مزہ دار روٹیاں دنیا کے کسی ہوٹل کے نصیب میں نہیں ہوتیں۔ مہندر جذبات میں ڈوبا سمجھا تا رہا۔

''سب بیکار کی باتیں ہیں۔'' بہو نے جواب دیا۔

''بھولیے مت اس میں سونا گڑا ہے۔ ہمارے سارے دلدّر دور ہو جائیں گے۔ راج اور شام کو سینک اسکول میں داخلہ مل جائیگا''۔

بہو کدالی کو پوری طاقت سے فرش پر مار رہی تھی۔ آنکھوں میں چمک تھی۔ دل میں وشواس تھا کہ بس لوہا جلد ہی پارس پتھر سے ٹکرائے گا اور کدالی سونا بن جائے گی۔

''مجھے کچھ سمجھاؤ یہ کیا پاگل پن سوار ہو گیا''۔

مہیندر آنکھیں پھاڑے سارا تماشہ دیکھتا اوب گیا۔

''ٹھاکر بابا کے تمغے اسی چولہے کے نیچے ماں جی نے چھپائے ہیں۔ سب سونے کے ہیں۔ انگریزوں نے دیے تھے''۔

مہیندر ہنس دیا مگر دل اس کا بھی للچا رہا تھا۔ وہ کہتا گیا فوج میں چاندی کے تمغے ملتے تھے اور ان کا مول ہی کیا تھا۔ اس کی بیوی ساڑی کے پلّو سے پسینہ پونچھتی بتاتی رہی۔ انگریز لوگ بہادروں کا بہت سمّان کرتے تھے خود اس کے نانا یونیورسٹی میں فرسٹ آئے اور انھیں انگریز کلکٹر نے گولڈ مڈل دیا تھا۔ وہ زمانہ آج کی سرکار جیسا نہیں تھا۔ اپنی سرکار چاندی اور گِلٹ کا میڈل دے کر بس پیٹھ تھپتھپا دیتی ہے۔ اچانک مہیندر چوکنا ہو گیا۔ بہو خوشی سے چیخ پڑی۔ وہ کدالی پھینک زمین پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے مٹی ہٹانے لگی۔ گرد و غبار صاف ہوا تو ٹین کا زنگ آلود ڈبّہ دکھائی دیا۔ بچّوں کے ٹفن باکس جیسا تھا۔ مہیندر نے جھپٹ کے اسے اٹھا لیا۔

''بس بس۔ ہمارے نصیب بدل گئے''۔

بہو چھوٹے بچے جیسی اُچھل کود کرنے لگی۔ دونوں آنگن میں آگئے تخت پر بیٹھے

اور مہیندر نے بھگوان کا نام لے کر ڈھکن ہٹا دیا۔ ''ہے پربھو یہ کیا؟''

بہو کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور ہونٹوں کے بیچ سے سیٹی سی نکل پڑی۔ مانو سائیکل کا ٹائر پنکچر سے بیٹھ گیا۔ ڈبّے میں سنگِ مرمر کا بنا چھوٹا سا تاج محل اور کوئی تولہ بھر چاندی کا میڈل زنجیر میں لپٹا رکھا تھا۔ برسوں ہوا اور روشنی سے محروم آب و تاب دھندلا گئی تھی۔

''یہ تو سونا نہیں ہے اور دیکھو میڈل پر چاند تارا بنا ہے۔ نہ جانے کس بھاشا میں کچھ لکھا بھی ہے''۔

بہو مردار مرغی جیسی تخت پر گر پڑی۔ مٹیالا تاج محل اسے ٹھاکر حویلی کے ٹوٹے ہوئے روشندان جیسا لگا۔ جو مکڑیوں کے جالے سے اٹا ہوا تھا۔ مہیندر نے تمغہ، اس کی چین کو پانی سے دھویا اور مُٹھی میں دبائے باہر نکل گیا۔ وہ سیدھا منشی ناظر علی دستاویز نویس کے پاس تیز تیز قدموں سے پہنچا جو بیرونی کمرے میں ٹائپ رائٹر پر اسٹامپ لگائے بیٹھا تھا۔

''چاچا۔ یہ دیکھنا اس پر کیا لکھا ہے۔ مجھے بابر بادشاہ کے زمانے کا سکّہ معلوم پڑتا ہے''

منشی ناظر علی نے غور سے دیکھا اس کے چہرے پر پاکیزگی کا نور بکھر گیا۔ بڑی تعظیم سے لہکتے ہوئے پڑھا۔

''نصرٌ من اللّٰہِ والفتحٌ قریب۔''

☆☆☆

نئے ویرانے

سورج ڈوبنے اور تاریکی کے انتظار نے اسے بےچین کردیا۔ روشنی اور اندھیرے کی آنکھ مچولی دنیا کے وجود کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ لیکن رات اس کی زندگی اور دل کی بیش قیمت دھڑکن تھی۔ اندھیرا اسکے جسم اور روح کو تروتازہ کردیا کرتا۔ بنگلے کے شمالی حصّے میں سرونٹ کوارٹر کے پچھواڑے اونچی گھنی بیری کے درخت کے کانٹے آج نہ جانے کیوں۔ اس کی آنکھوں کے بند پپوٹوں کو چھید رہے تھے۔ اس نے وزیر اوقاف ذاکر علی کے لان کی طرف گردن گھمائی۔ ذاکر علی اپنے محکمے کے سکریٹری دلیپ رائے اور اوقاف بورڈ کے چیئرمین مولوی مسعود بیگ سے کسی خاص فائل پر چرچا کر رہے تھے۔ صوفوں کے بیچ ایرانی قالین پر شیشے کی بڑی سینٹر ٹیبل رکھی تھی۔ پلیٹوں میں انگور، سیب اور کیلے زینت بڑھا رہے تھے۔ ذاکر علی کا محکمہ ریتیلے میدان سا خشک اور بنجر تھا صوبے کی تین کروڑ آبادی میں پچاس لاکھ مسلمان تھے۔ اقلیتی بہبود اور اوقاف کا محکمہ سیکولر آئین کا آئینہ دار تھا۔ اکثریت حاصل کرنے والی پارٹی کا ایک ہی ایم ایل اے جیت پاتا اور وزارت خود ہی اٹکھیلیاں کرتی اس کی چوکھٹ پر سجدہ کرتی۔ ذاکر علی دوسری بار اسمبلی چناؤ جیتے تھے۔ ان کی پیٹھ پر پانچ سال کے بھرپور تجربے کی گٹھری کا بوجھ تھا۔ بڑی شان سے پندرہ اگست اور چھبیس (۲۶) جنوری کی پریڈ کی سلامی بھی لی تھیں۔ وہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ اب کی بار کوئی ملائی دار محکمہ ضرور مل جائے گا۔ وہ بھول گئے کہ سیاست بھی طوائف کا روپ دھار گئی ہے۔ نوٹوں کی

سرسراہٹ پر غمزے اور اداؤں کا خمار پل بھر میں انڈیل دیتی ہے۔ اور تو اور نتھ اتارنے کے لیے بھی بڑی بڑی بولیاں لگائی جاتی ہیں۔اب زمینداروں اور جاگیرداروں کا زمانہ نہیں رہا کہ جس پر دل آیا کوٹھے سے اٹھوالیا۔ سوذاکرعلی کی قسمت اس بار بھی اوندھی ہی رہی۔ وہ چندن لال ساہو کی خوش نصیبی کو کوستے رہے۔ حلف اٹھانے کے بعد لال بتّی والی کار میں بیٹھتے ہی مدھم آواز میں مولوی مسعود بیگ سے بولے۔

''دیکھ لیا تم نے۔ چندن کے باپ دادا کو برسوں بیل اور کولہو کے گرد چکّر لگاتے ان آنکھوں نے دیکھا ہے۔یقین کرنا''

مسعود بیگ نے گواہی دی۔

''جی ہاں۔خوب جانتا ہوں۔ میں بھی اسی شہر میں پیدا ہوا تھا۔اس کا باپ کندن لال میرے گھر خود ہی تیل دے جایا کرتا تھا۔ دو روپیہ کا ایک سیر تلی کا خالص تیل''

''بتایئے بھلا۔ پہلی بار ایم ایل اے بنا۔ ہاتھی دانت سے قسمت لکھوائی ہے۔اتنے بڑے پی ڈبلوڈی محکمہ کا وزیر بنا دیا۔ ہزار روپیہ نوٹ والے زمانے میں کم بخت کولہو کو بھی بھول گیا۔''

سورج ڈوبا اور بنگلے کا کونہ کونہ روشنی میں نہا گیا۔ سکریٹری نے اجازت لی ،اٹھ کر کھڑا ہوا۔تو ذاکرعلی نے اسے یاد دلایا کہ اوقاف والا پروپوزل فائل کے ساتھ کل پیش کر دیں۔ مولوی مسعود بیگ خاموش رہا۔ سکریٹری اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔تو اس نے ناگواری سے ذاکرعلی کو بتایا کہ سکریٹری بالکل گھگھو ہے۔ بورڈ نے ریزولیشن پاس کر دیا ہے۔سرکار کو صرف نوآبجکشن دینا ہے کیونکہ سب سے بڑے بازار کی عمارت کا معاملہ ہے۔دوکاندار اڑچن نہ ڈالیں۔

''بیگ صاحب۔ آدمی چلّو میں اُلّو ہو جاتا ہے۔ ریونیو بورڈ میں

کھونٹے سے بندھا تھا۔ مکھیہ منتری جی سے کہہ کر اپنے محکمے میں
پوسٹنگ کرادی''

اسے بھوک لگ رہی تھی۔ بنگلے کی طرف سے کان پھیر لیے اور آنکھیں کھولیں۔ وہ مہینے بھر سے مولوی مسعود بیگ کو وہاں آتے جاتے دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی رات گئے تک بغل میں دبی فائل کھول کر ذاکر علی کو اس میں پوشیدہ دفینے کا نقشہ سمجھاتا۔ نواب بیگمات کے دَور کا بسایا ہوا مارکیٹ ہے۔ نئی عمارت شہر میں چار چاند لگا دیگی۔ جاتے وقت دس لاکھ روپیے کی آمد کا بھی یقین دلاتا۔ جسے سن کر ذاکر علی کی ہتھیلیاں کھجلانے لگتیں۔ بیری کے جھاڑ والے کو معاملے کی پوری نوعیت کا علم تھا۔ جامع مسجد کے نچلے حصے میں سو سال پرانی دوکانیں تھیں۔ ان میں کپڑے کے دھنا سیٹھ برسوں سے کرایہ دار تھے۔ سامنے بیس فٹ کی سڑک کے دوسری طرف ایک منزلہ چالیس دوکانیں تھیں۔ نوابی ریاست ختم ہوئی تو ان کی ملکیت ریاستی اوقاف بورڈ کو منتقل ہوگئی۔ شہر کے ایک نامی بلڈر نے مولوی مسعود بیگ کے کان میں سحر پھونک دیا۔

''چالیس دوکانوں کی چھت اوقاف سے پچاس ہزار ماہوار کرائے پر
دلوادیں''۔

بلڈر کی یوجنا تھی کہ وہاں تین منزلہ سو (۱۰۰) چیمبر بنائے گا۔ نیچے کی دوکانیں موجودہ حالت میں محفوظ رہیں گی۔ مسعود بیگ کی دلیل وزن دار تھی کہ کرایہ سے اوقاف کی آمدنی بڑھ جائے گی۔ اُلّو کچھ دیر تک اپنی بیٹی کی باتیں سُنتا رہا۔ مسعود بیگ کو گئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ تب سے وہ اس کی جان کھا رہی تھی۔

''ذرا رُکو بیٹی۔ آم کے پیڑ پر گھونسلے میں کل ہی کوّے نے انڈے دیے ہیں''۔ اتنا کہا اور اُلّو بیری کے پیڑ سے تاریکی میں اُڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد لوٹ کر آیا اور اپنے چتکبرے گھنے پروں کو نکیلی چونچ سے صاف کرنے لگا۔ چونچ پر انڈے کی زردی جم گئی تھی اس نے گول گول آنکھیں گھمائیں اور پوچھا۔

''وہ اُلو کا پٹھا کون ہے۔ کیا ذات ہے۔ کہاں رہتا ہے؟''

''ڈیڈی آپ نے مکھیہ منتری کا بنگلہ دیکھا ہے''

''ہاں ہاں۔ کئی بار وہاں سے گذر رہوا ہے۔ باغ میں کٹھل کے چار پیڑ ہیں۔ کوے بہت بیٹھتے ہیں''

''وہیں۔ نیم کے درخت پر اس کا باپ رہتا ہے۔ بڑا گبرو ہے۔ میں اس کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی ڈیڈی!''

ڈیڈی غصہ سے بے قابو ہوگیا۔ ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے شاخ پر زور زور سے پنجے مارنے لگا اور بیٹی کو تلخ لہجہ میں بتایا کہ وہ غدار نسل کا ہے۔ اُلو قوم کا دشمن قندھاری۔ ہماری قوم پر تھوکا ہے فریبیوں نے۔ نام سنتے ہی کانوں میں آبلے پڑ جاتے ہیں۔ قندھاری خاندان نے اُلو نسل کا قیمتی راز انسان کے آگے اُگل دیا تھا اور تب ہی سے دو ٹانگوں والے شاطر انسان اُلوؤں کے جانی دشمن ہوگئے۔ ہمیں منحوس قرار دیدیا گیا۔ بیٹی کے اصرار کرنے پر ڈیڈی نے ر ز کا انکشاف کیا۔ اُلو کی گردن کاٹ دو اسکی ایک آنکھ خود بخود بند ہو جاتی ہے۔ لیکن دوسری آنکھ کھلی رہتی ہے اور اگر انسان نابکار کھلی آنکھ کو انگوٹھی کے نگینہ میں لگوا کر پہن لے تو جب تک اتارے گا نہیں وہ کم بخت جاگتا رہے گا۔ بند آنکھ بھی اسی طریقہ سے پہنے تو وہ سوتا ہی رہے گا کنبھ کرن کے موافق۔ بیٹی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''اس سے کون سا آسمان ٹوٹ پڑا؟ اس نے جملہ پورا کیا اور اڑنے کے لیے بازو تولے۔ اسے دوسرے پیڑ پر کوے کا بچہ نظر آ گیا تھا۔

''میں ابھی آئی ڈیڈی''! وہ اندھیرے میں کھوگئی اور ڈیڈی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ انڈے سے نکلی اور آنکھ کھولی تھی کہ اس کی ماں کو جنگلی بلّی نے دبوچ لیا۔ اسے یاد تھا دو انڈے ہوئے تھے۔ وہ نسلی نظام سے اچھی طرح واقف تھا۔ انڈے سے اُلو کا صرف ایک ہی بچہ نکلتا ہے۔ بیتی پیڑھی بزرگوں سے پوچھتی رہی، سر پٹکتی رہی مگر یہ

پہیلی کوئی نہ سلجھا سکا کہ دونوں انڈوں سے۔ بچّے کیوں نہیں نکلتے۔ تھوڑی دیر بعد بیٹی اپنا پیٹ بھر کے لوٹ آئی۔

''ہاں ڈیڈی۔ قندھاریوں نے راز کھولا۔ اس کا ہم پر کیا اثر ہوا۔ ظالم اور مکّار انسان سوتا رہے۔ تو دنیا ختم ہو جائیگی؟''

''تیری عقل میں اب بھی اُلو پن کا خمیر نہیں اٹھا۔ کوے کے ہزار انڈے بچّے کھا کر ہی اُلو کاٹھ سے اُڑتا ہے بیٹی!''

وہ بھڑک اٹھی مگر آہستہ سے بولی۔

''آپ بھی تو انسانوں کی طرح سمجھا رہے ہیں۔ ذرا اُلو شیلی میں سمجھایئے''

اس نے اپنے اُلو پن کو بیری کے کانٹوں میں الجھا دیا اور مدرسے کے تجربہ کار استاد جیسے انداز میں کافی دیر تک بیٹی کو پاٹھ پڑھاتا رہا۔ جمہوریت میں جب اقتدار کے چسکے نے سیاست کو دوشیزگی دی اور نیتاؤں کے بڑھاپے میں اُبال آیا تو کرسی نے ان کا وجود چھین لیا۔ لاچار اور غریب جنتا کی مصیبتیں بڑھتی گئیں وہ روٹی کپڑا اور مکان کے سپنے دیکھنے میں مگن رہے۔ ساہوکار اور کرخندار ہمالیہ سے اونچے ہو گئے۔ اوپر سے نیچے تک رشوت خوری عام ہو گئی۔ ذات پات اونچ نیچ صدیوں پرانا چولا پہنے رہی۔ دھرم اور مذہب آدم خور ہو گیا۔ منشی لال کھادی والا کے بنگلے میں کبھی انگریز گورنر جنرل رہا کرتا تھا۔ وہیں نیم والے قندھاری اُلو کے پُرکھوں نے انگریز سرکار کے بہکاوے میں آکر بند آنکھ اور نگینہ والا اُلوؤں کا پُشتینی راز اُگل دیا۔ انگریز بڑی شاطر قوم ہوتی ہے اس نے جاتے جاتے ملک کے دو ٹکڑے کر دیے۔ دونوں کے سربراہ کو اُلو کی بند آنکھیں دیدیں اور خود کھلی آنکھ لے کر لندن لوٹ گئے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان دونوں ملکوں کے رہنما نیکی، سچائی اور حق وانصاف کی فریاد نہیں سنتے کیونکہ وہ سوتے رہتے ہیں۔

وہ بولتے بولتے تھک گیا۔ بیٹی کو ایک بار پھر بھوک کا احساس ہوا اور کانوں میں قندھاری گبرو کی گھگھو سنائی دی۔ اس نے ڈیڈی سے کچھ نہ کہا اور پُھر سے تاریکی

میں گم ہوگئی۔ منشی لال کھادی والا کا بنگلہ زیادہ دور نہیں تھا۔ نیم کے پیڑ تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ وہ نیم کی اس شاخ پر اتر گئی جہاں قندھاری گبرو مجنوں کی طرح آنسو بہا رہا تھا۔ ان دونوں نے تاریکی کے بادلوں میں بارہا ایک ساتھ اُڑان بھری تھی۔ کوّوں کے انڈوں، بچّوں کا جی بھر کے ناشتہ کیا تھا۔ قبیلے کی صدیوں پرانی رنجش اور دشمنی کو نیست نابود کرنے کی قسم کھائی تھی۔ مکھیہ منتری کا بنگلہ بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ ان کی سالگرہ تھی۔ ''بڑی دیر کی جانِ من'' اس نے بھاری من سے ڈیڈی کی ضد اور قندھیاروں سے ازلی دشمنی اور نفرت کا دل کھول کر بکھان کیا۔ پھر اُداس ہوگئی۔

''جانِ من! میں پہلے بھی بتا چکا ہوں، میرے پرکھے انگریز تانترک کے جھانسے میں آگئے اور راز اُگل دیا۔ اس گورے جادوگر نے اُلو جگانے کی پرتکیا کی اور کامیاب ہوگیا۔ کوئی بھی اُلو ہوتا تو گھٹنے ٹیک دیتا۔ یہ عہد توڑنا رہتی دنیا تک جرم بن گیا۔''

وہ دونوں باتوں میں مشغول تھے کہ بنگّے میں پولس بینڈ نے دھن چھیڑ دی۔ دونوں ادھر دیکھنے لگے۔ منشی لال کھادی والا صوبے کے ڈائریکٹر جنرل پولس کے ہمراہ چہل قدمی کرتے ہوئے ادھر کو نیم کے نیچے چلے آئے۔ کھادی والا کہہ رہے تھے۔

''چناؤ ہر قیمت پر جیتنا ہے اس وقت مسٹر کمار۔ چھ مہینے رہ گئے ہیں''

''سر خفیہ سروے سے پتہ چلا ہے کہ سیکولر نعروں سے اکثریت اُکتا چکی ہے''

کھادی والا کھنکارتے ہوئے آہستہ سے بولے۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ نیم کے درخت کو دودھ شکر سے سینچنا بیوقوفی ہے۔ مسٹر کمار آپ ایسا کریں کانجی ہاؤس سے دو چار بیمار گائیں زرخرید قصائیوں کے حوالے کردیں''

''پورے صوبے میں آگ پھیل جائیگی سر''

''چھوڑیئے۔ اُلو والی انگوٹھی پہن کر سو جایئے''

منشی لال کھادی والا فیصلہ سناتے واپس مُڑ گئے۔ قندھاری خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس کے جدِ امجد کا فارمولہ چارسو رقص کرنے لگا۔ انسانوں کے جلنے کی بو پھیلتی محسوس ہوئی جو اس کی محبوبہ سے برداشت نہیں ہوئی۔ وہ بازو پھیلائے ذاکر علی کے بنگلے کی طرف اڑتی گئی۔ بیری کا پیڑ مقناطیس جیسا اسے کھینچ رہا تھا۔

''ڈیڈی، ڈیڈی''

''کیا ہے بیٹی؟ تُو اتنی گھبرا کیوں رہی ہے؟''

''نگینہ والی انگوٹھی کا کوئی توڑ نہیں ہے؟''

''کتابوں میں تلاش کرو تو مل جائے گا مگر ایسی کتابیں ملنا مشکل ہے۔''

''آپ کے لیے مشکل نہیں۔ ڈیڈی ڈھونڈیے''

ڈیڈی اسے بہلانے لگا۔ خوب سمجھایا بھی۔ پہلے چنگیز خاں نے بغداد کے نایاب کتب خانے خاکستر کر دیے۔ اب رہی سہی کسر امریکہ نے پوری کر دی۔ قندھار بھی ملیامیٹ ہو گیا۔

''ڈیڈی، امرناتھ کی یاترا کریں، وہاں کچھ مل جائے؟''

ڈیڈی نے مایوسی سے سر ہلا دیا کہ ہمالیہ میں خاک ملے گا؟ پاربتی نے جیون کے راز جاننے کی ضد کی۔ شیو جی انھیں امرناتھ لے گئے۔ کوئی نہیں جانتا کہ کون کون سے رہسیہ شیو جی نے انھیں بتائے۔

''پرنتو بات کیا ہے؟ کچھ کہہ، منہ کھول''

''گائے کاٹی جائیں گی، آدمی وحشی درندہ ہو جائیگا۔ ایک دوسرے کا سر کاٹے گا؟''

ڈیڈی نے گول گول آنکھیں گھمائیں۔ مولوی مسعود بیگ کار میں بیٹھے نظر آئے۔ بال بچے بھی ساتھ تھے۔ ڈگی میں سے چار سوٹ کیس اتارے گئے۔ ڈیڈی نے مولوی مسعود بیگ کے ہوائیاں اڑتی دیکھیں۔ ان کی بکھری داڑھی اور کانپتا جسم زخمی

پرندے کی طرح لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ دونوں گھبرائے ہوئے تھے۔ ڈیڈی اور بیٹی کے کان ادھر کی سننے جُٹ گئے۔ مسعود بیگ نے مشورہ دیا کہ مکھیہ منتری کو فون کریں ایک خاص طبقے پر منصوبہ بند حملے ہو رہے ہیں۔ نسل کشی ہو رہی ہے۔ عورتوں اور بچّوں کو بخشا نہیں جا رہا۔ وہ نامی گرامی بلڈر جو دس لاکھ کی بھاری رقم دے رہا تھا اس کا گھر بھی جلا کر راکھ کر دیا۔ ذاکر علی کے ہوش اڑ گئے۔ انھیں عورتوں کی آبرو ریزی، بچّوں کے قتلِ عام اور اقلیتوں کی غارت گری کی دہشت ناک داستان پر اتنا دُکھ نہیں ہوا جتنا بلڈر کے مکان کی آتشزدگی کی خبر نے ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ مردہ آواز میں بولے۔

''مکھیہ منتری نیند کی گولی کھا کر سو رہے ہیں۔ سالگرہ کے دوران بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا'' تبھی اُلوؤں کی گھوگھو نے دونوں کے چہرے فق کر دیے۔

''یہ اُلو کیوں رو رہے ہیں''

انھوں نے اردلیوں کو آواز دی۔ ''نحوست پھیلا رکھی ہے بنگلے میں'' اردلی آئے تو انھیں حکم دیا کہ پیٹرول چھڑک کے بیری کے پیڑ کو آگ لگا دی جائے۔ صبح تک اس بیری کا وجود باقی نہ رہے۔

ڈیڈی کے کاٹو تو خون نہ رہا۔ بدن سُلگ اُٹھا۔ ہلکے پھلکے پروں پر جیسے اُبلتا لاوا آ گرا۔ بیٹی کی آواز بیٹھ گئی۔ سر سے پنجوں تک سہم کے اس نے بھیگی آنکھوں سے ڈیڈی کی طرف دیکھا۔ جو خوف سے بُت بنا بیٹھا تھا۔ بیری کے پیڑ کو جلا دینے کے حکم نے اسے ادھ مرا کر دیا۔ باپ دادا نے بھی بیری پر جنم لیا تھا۔ پیڑ پر پھل نہ آتے ہوں مگر اس پر بے ضرر نسل کی وراثت کی بُو باس باقی تھی۔ نکیلے سوکھے کانٹے دن رات دیوالی کے چراغوں جیسے جھلملاتے تھے۔ اس کی بے جان ٹہنیوں پر آنکھیں بند کیے سورج ڈوبنے تک ڈیڈی کے پُرکھے فخر محسوس کرتے تھے کہ دولت کی دیوی لکشمی کی سواری ہیں اور ان کی پوجا رہتی دنیا تک ہوتی رہیگی۔ دیوی کے شردھالو سدّھی حاصل کرنے کے جتن

میں صدیوں سے رات رات بھرانھیں جگانے میں تلے رہتے ہیں۔

تبھی دونوں کی کو پیٹرول کی بُو آئی۔ پیڑ کی جڑ میں پیٹرول اونڈیلا جارہا تھا۔

''چلو بیٹی، قندھاری کے نیم پر چلتے ہیں۔ ہمارا بسیرا لُٹنے والا ہے''

ڈیڈی نے دل ہی دل میں پرتگیا کی کہ وہ آج کی خونیں رات ہزاروں سال کے دہکتے جوالامکھی میں ہمالیہ کے برفیلی چٹانیں دھکیل دے گا۔ قندھیاروں سے دشمنی ترک کر کے اپنی بیٹی کا بیاہ رچا دیگا۔ دونوں نے حسرت سے بیری کے پیڑ کو تا کا جو آگ کی لپٹوں میں جیون لٹا رہا تھا۔

''ڈیڈی، پیڑ تو جلتے رہیں گے۔ ہم کہاں اپنا بسیرا بنائیں گے؟''

''اری پگلی انسان لڑیں گے، بستیاں اجڑیں گی تو قدم قدم پر نئے ویرانے ہمیں بسیرا دیں گے''

☆☆☆

اَگنی پریکشا

شمسہ کو سب سے زیادہ فکر ایواساکی کے دونوں بچوں کی تھی۔ کانچ کی چھوٹی چھوٹی گولیوں جیسی آنکھیں سب کو خوفزدہ دیکھتیں تو دُور آسمان میں چمکتے تاروں کی طرح ٹمٹمانے لگتیں۔ جب وہ آئے تھے تو بورڈنگ کے لڑکے دھیمی آواز میں انھیں آلو بخارہ کہنے لگے تھے۔ ایواساکی جاپان کے محکمہ صنعت میں اعلیٰ افسر تھے۔ فادر ولیم ایک سال ٹوکیو میں رہ چکے تھے۔ اور یوں ایواساکی سے گھریلو رشتہ ہوگیا۔ رُڑکیلا اسٹیل پلانٹ کے افسران سے کاروباری معاملات سلجھانے دہلی سے اپنی بیوی اور بچّوں کے ہمراہ فادر ولیم سے ملنے آگئے۔ بچوں کو واپس آنے تک فادر کے بورڈنگ میں چھوڑ دیا۔ ویسے بورڈنگ کے بچے بچے شمسہ کی ذمہ داری تھے ہی۔ لیکن ایواساکی کے بیٹے اس کے لیے قیمتی امانت بن گئے۔ وہ خاموش تھے گونگوں کی طرح ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مانوس الفاظ ہی منہ سے نکلتے تھے۔ بارہا شمسہ اور دوسرے بچوں کے سامنے جھک جھک کر تعظیم دیتے۔ نہ جانے ان کی کمر میں کون سے اسپرنگ لگے تھے۔ شمسہ سمجھ گئی اس حرکت میں آداب وتمیز کا کوئی دخل نہ تھا۔ وہ صرف خوف بھرے ماحول کا ردِعمل تھا۔ دو دِن کی دہشت زدگی نے گالوں کی سُرخی کافور کر دی۔ جنھوں نے ناگاساکی اور ہیروشیما کی قیامت نہ دیکھی ہو ان کے لیے انسانوں کا قتل، آتشزنی اور خون جما دینے والے نعرے کیا کم خوفناک تھے۔ موسلا دھار بارش میں درخت کی ٹہنی پر سکڑی سکڑائی چڑیا جیسے وہ شمسہ کی گود میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شمسہ نے دوسروں کا دل بہلانے کو کہانی

سنانی شروع کی۔

یہودی نسل کے ایک بادشاہ نے حضرت عیسیٰ کی قوم کی ہلاکت کی خاطر آگ کے پاس ایک بُت کھڑا کر دیا کہ جو بت کو سجدہ کرے گا چھوٹ جائے گا اور اگر نہیں کرے گا آگ میں بھسم ہو جائے گا۔ وہ ایک عورت اور اس کے بچے کو بُت کے سامنے لایا ایک طرف آگ بھڑک رہی تھی اور حکم دیا

''اے عورت اس کو سجدہ کر ورنہ تو آگ میں جھونک دی جائے گی''

وہ عورت پاک دین والی اور مومن تھی۔ اُس نے بُت کو سجدہ سے انکار کیا۔ بادشاہ طیش میں آگیا اور بچہ کو چھین کے آگ میں جھونک دیا۔ عورت ڈر گئی اور دل کو ایمان سے ہٹایا۔ اس نے چاہا کہ بُت کو سجدہ کرے۔ تب ہی بچہ چیخا کہ ماں میں مرا نہیں۔ اندر آ جا۔ میں اس جگہ اچھا ہوں۔ ماں اندر آ۔ آگ کی صورت کا پانی دیکھ۔ حضرت ابراہیم کے راز دیکھ۔ یہاں آگ میں گلاب اور چنبیلی کے پھول کھلے ہیں۔ یہ آگ آگ کی تاثیر نہیں رکھتی''

شمسہ کو تاریخی اور مذہبی کتابیں پڑھنے کا جنون تھا۔ کالج میں بھی اور بورڈنگ میں بھی۔ ایم اے اس نے تاریخ میں کیا تھا۔ اُسی دوران لائبریری سے جاپان کے جنگجو ایڈمرل ٹوگو کے حالات زندگی پر کتاب لائی اور دیر رات تک پڑھتی رہی۔ وہاں کے مشہور شاعر اور سپہ سالار اجنرل نوگی پر چار دن پہلے شمسہ نے مضمون پڑھا تھا۔ جانباز سپہ سالار نے کہا تھا

''وہ قیمتی پتھر ہوں یا چمکتا ہوا سونا۔ ایک سپاہی کو ان کی کیا حاجت ہے۔ اس کے لیے تو نیک نامی ہی ایک بے بہا دولت ہے۔ زندگی سے بھی زیادہ قیمتی''

رات کافی بیت چکی تھی مگر شمسہ کی آنکھیں کتاب کے ہر لفظ کو نہارنے کے لیے بیدار تھیں۔ جاپانی جنگجوئی اور امن مزاجی دونوں کے لیے مشہور ہیں۔ موت پر

انھیں ہنسی آتی ہے۔ بچہ بچہ وطن پرست اور عورتیں قربانی والی۔ پولس کے کارندے غریبوں، محتاجوں اور مظلوموں کی بے لوث مدد کرتے ہیں۔ اسکول کا کوئی طالب علم حادثہ میں زخمی ہو جائے تو بھاگے بھاگے اسپتال لے جاتے ہیں اور خون کی ضرورت ہو تو پیچھے نہیں ہٹتے۔

چاروں طرف آگ اور بھڑکتے شعلے ہی شعلے تھے۔ گاڑھے دھوئیں کی دیواریں چیخ و پکار کو بلند ہونے سے روک رہی تھیں۔ ہوا کے جھونکے آتے اور شمسہ کے نتھنوں میں انسانی گوشت کی کڑوی چڑاندھ پھینک جاتے۔ ابھی کل تک باہر گلاب کے بے شمار پودے تھے۔ اُن کی رنگ برنگی خوشنمائی دلوں میں امنگ اور چہروں پر تازگی لاتی تھی۔ لان کی ریشم جیسی گھاس پر بچے لوٹتے پھرتے۔ آگ کی لپٹوں نے باغیچہ کا وجود ہڑپ لیا تھا۔ اس نے آنسو بہاتے سہمے ہوئے بچوں کو گردن کے اشارے سے ڈائننگ روم میں چلنے کا اشارہ کیا تبھی وحشت ناک خاموشی کو چیرتی کڑک دار آواز نے شمسہ کے کان کے پردے پھاڑ دیئے۔

''کوئی ہے جس نے اپنی ماں کا دودھ پیا ہو۔ باہر آئے میرے سامنے!''

یہ آواز شمسہ کو اس بھیڑیئے کی چیخ سی لگی جو بھوک سے لاچار ہو کر چلاّتا ہے اور تب اس کی آواز سن کر جنگل کے تمام بھیڑیئے، اس کے پاس آپہونچتے ہیں۔

شمسہ دو دن سے گاؤں سے کافی فاصلہ پر چار ایکڑ زمین پر پھیلے گرجا گھر کے بورڈنگ کی چھوٹی سی عمارت میں نفرت کے لاوے سے جھلس رہی تھی۔ دس سے پندرہ سال عمر کے بیس لڑکے صلیب پر جھول رہے خداوند کے بیٹے کے سامنے گڑگڑاتے ہاتھ پھیلائے نڈھال ہو چکے تھے۔ آنکھیں رونے بلکنے سی سوج گئیں تھیں۔ راشن صبح ختم ہو گیا تھا۔ پانی کے مٹکے پر ان کی زندگی ٹکی ہوئی تھی۔ کمپاؤنڈ کے باہر سڑک کنارے کی دوکانیں اور سرونٹ کوارٹرس کل ہی راکھ ہو گئے تھے۔ گاؤں اور شہر کے درمیان تین کلومیٹر کی دوری تھی۔ ٹیلیفون کے تار ٹوٹے پڑے تھے۔ شمسہ، لڑکوں کا لرزتا وجود اور

دل دہلاتے نعروں کے سوا وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ دو پہر میں شمسہ نے چار لاٹھی بردار پولس سپاہیوں کو دیکھا تو خوشی سے اُچھل پڑی۔ اسے یاد آیا رشی وشوامتر نے راجہ دشرتھ سے انورودھ کیا تھا کہ جنگل میں ان کے آشرموں کو راکشس آکر برباد کر دیتے ہیں اور رشی منیوں کو پریشان کرتے ہیں۔ یگیہ نہیں ہونے دیتے اس لیے اپنے دو بیٹے رام اور لکشمن ہمارے تحفظ کے لیے سپرد کر دیں۔ شمسہ کو حیرت تھی کہ ان کی حفاظت کے لیے بھیجے گئے چاروں سپاہی نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔

میڈم کیا ہم مر جائیں گے! دو لڑکوں نے سسکتے ہوئے پوچھا۔ شمسہ کو پھیکی سی ہنسی آئی ساڑی سنبھالی اور دونوں کو اپنے سے چپکا لیا۔

''گھبراؤ مت۔ ابھی میڈم زندہ ہے اور آخری سانس تک تمھاری حفاظت کریگی''!

ان میں سے بڑی عمر کے لڑکے نے خوف پر کچھ قابو پایا اور اٹکتے لہجہ میں کہا۔

''میڈم۔ پولس کو فون کیوں نہیں کرتیں۔ وہ سب کی رکشھا کرتی ہے!''

شمسہ نے ریسیور اٹھایا اور پوچھنے والے کے کان سے لگا دیا۔

''مائی ڈیر بوائے۔ یہ مر چکا ہے۔ دیکھو خاموش ہے۔''

شمسہ کے اعصاب پچھلے کئی گھنٹوں سے دہشت اور خوف کے نوکیلے کانٹوں میں الجھے ہوئے تھے۔ وہ خود کو پاگل خانے کا مریض محسوس کر رہی تھی۔ جہاں دوسرے پاگل اس کے دماغ سے اٹھکھیلیوں میں مصروف تھے۔ کوئی ایڈمرل ٹوگو کے انداز میں وائرلیس پر آبدوز سے دشمن کے بحری جہاز پر تارپیڈو چھوڑنے کا حکم دے رہا تھا۔ اور کسی کونے میں جنرل نوگی چپٹے چہرے اور بٹن جیسی آنکھوں والے سپاہیوں کو دشمن پر ٹوٹ پڑنے کی کمانڈ دے رہا تھا۔ وہ سب ایک سُر میں گا رہے تھے۔

''ہم جاپانی سپاہی۔ ہم دیش بھگت اور جن سیوک ہیں''

''ہم جاپانی سپاہی۔ دُکھیارے بے بسوں کے ہم جولی ہیں''

''ہم جاپانی سپاہی۔ نیک نامی اور فرض شناسی کے پرستار ہیں''

''ہم جاپانی سپاہی۔ ایٹم بم سے ہار گئے''

نیچے کمپاؤنڈ میں وحشی ریوڑ دو دن کے خونی کھیل کے بعد تھکاوٹ دور کرنے میں مشغول تھا۔ شمسہ نے کھڑکی سے جھانکا سب شراب پی رہے تھے۔ دُبلا پتلا، مریل سالا بے قد کا ان کا سردار ہاتھ میں نوکیلا ترشول تانے اوپر کی منزل کو تاک رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے اسی نے ماں کا دودھ پینے والے کو للکارا تھا۔ شمسہ مقتل ایسی ویرانی میں بھی کھلکھلا پڑی۔ اپنے آپ سے بولی ''مچھر کہیں کا۔ اسے تو بورڈنگ کے دولڑکے ہی کھدیڑ دیں'' اس کی یادداشت میں بکھری تاریخ کی کنکریاں چبھنے لگیں۔ پرانے زمانے کی جنگوں کے مناظر ابھر آئے۔ نقارے، ڈھول تاشے اور بگل۔ جیسے ہی صدائے جرس بلند ہوئی لشکر نے کوچ کیا۔ دشمن کی فوج نے بھی قدم آگے بڑھائے۔ آسمان تھرّا اُٹھا۔ چرندے، درندے اور پرندے سراسیمہ ہوکر ادھر ادھر بھاگے اور اڑ گئے۔ بہادری اور مردانگی کے جوہر دکھانے کو بے تاب تلواریں اور نیزے تڑپنے لگے۔ گھوڑوں کی ٹاپوں اور ہاتھیوں کی چنگھاڑ سے پہاڑ کی چوٹیاں لرز اٹھیں۔ میدان جنگ میں ایک دوسرے کی صفوں کا جائزہ لیا جانے لگا۔ تبھی صفوں کو چیرتا، گھوڑا دوڑاتا فولادی زرہ بکتر پہنے جنگجو میدان میں آگے آتا۔ ایک ہاتھ میں گھوڑے کی لگام اور دوسرے میں شمشیر برہنہ اٹھائے گرجدار آواز میں دشمن کو چیلنج کرنے لگا۔

''ہے کوئی تمھارا بہادر لڑاکو جو میرا مقابلہ کرنے میدان میں آئے؟''

شمسہ کو پرانی تاریخ کی کتابوں میں بس یہی للکار پسند تھی۔ جوانمردی، حوصلہ اور اعتماد سے بھرپور۔ جو اپنی قدوقامت کے سورما کو دعوت دیتی تھی!'' ہے کوئی تمھارا بہادر لڑاکو۔۔۔! گھوڑے پر سوار ایسے دلیر جانباز کی بے خوف چینوتی میلوں دور اسکے گھر کے بچّوں اور عورتوں کے سینہ میں فخر اور غرور کی جوالا بن جاتی ہوگی۔ نیچے سے ماں کے دودھ کو نفرت اور بزدلی سے خبردار کرتی آواز پرندوں کے شکار پر نگاہیں گاڑے

بے رحم صیاد کی سسکاری تھی۔ تین دن پہلے یہی لڑکے اسکول کے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ زورزور سے عبادت میں مشغول تھے۔

''کمزور ہاتھوں کو طاقت اور ناتواں گھٹنوں کو توانائی دو۔ ان کو جو کچے دل والے ہیں کہو ہمت باندھو۔ مت ڈرو۔ دیکھو تمھارا خدا سزا اور جزا لیے آتا ہے۔ ہاں خدا ہی آئے گا اور تم کو بچائے گا''

چوبیس گھنٹے کی دہشت زندگی نے شمسہ کے صبر کا باندھ تہس نہس کر دیا۔ اسے جھرجھری آ گئی۔ نہ جانے آنسوؤں کے کتنے گھونٹ پی گئی۔ اُسے قدم قدم پر موت نظر آنے لگی۔

''میڈم۔ خدا کب آئے گا؟

''ہمیں بچانے میں کتنی دیر کر رہا ہے!''

''بس آپ ہی ہمت بندھا رہی ہیں۔ وہ کیسا خدا ہے۔ جو ڈر رہا ہے!''

لڑکے سوال پوچھ رہے تھے اور شمسہ انھیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے تاکتی رہی۔ کمپاؤنڈ کی بے جان مٹی ایک بار پھر جاگ اُٹھی۔ بھاری قدموں کی ہلچل شروع ہو گئی۔ خونخوار ہولناک نعرے اوپر کی کھڑکیوں کے شیشوں پر دستک دینے لگے۔ بچّوں کے دلوں کی دھڑکن میں ماں باپ کی بے بسی ہچکولے کھا رہی تھی۔ شمسہ کی یہی کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح ان کی آنکھوں پر تسلّی اور ہمّت کی ایسی نقاب ڈالتی رہے جو موت کے بھیانک جبڑوں کو چھپا سکے۔

''ڈرو مت۔ گاڈ از گریٹ۔ وہ ضرور ہماری مدد کرے گا''

معصوم چہرے کٹھ پتلی جیسے سپاٹ اور ان کے کمزور جسم زندگی کا امرت پینے کو بے چین تھے۔ شمسہ ان سب کے بیچ فرش پر بیٹھ گئی۔ چھوٹے لڑکے اس کی گود میں آ دبکنے کو زور آزمائش کرنے لگے۔ مانو شیرنی کے بچّے دودھ پینے کی ہوڑ میں ہوں۔ شمسہ کے ہاتھ باری باری ان کے سروں پر تھپکی دیتے رہے اور جلد ہی

نیند کے خمار میں وہیں ڈھیر ہو گئے۔ بڑا لڑکا جاگتا رہا۔ شمسہ نے اسے بھی اپنے پاس لٹا لیا اور کچھ پل کے لیے اپنی عمر کی سوئیوں کو ۳۵ سال پیچھے گھما دیا۔

پاپا شہر کے نامی گرامی ڈاکٹر تھے۔ ڈرائینگ روم میں منجھلے بھیا کو سمجھا رہے تھے۔

''ماں کا دودھ بچّے کے لیے آب حیات ہوتا ہے۔ شمسہ کی امّی کے دودھ نہیں اترتا تھا''

دادی کے ہوش گم ہو گئے۔ پہلوٹی کی پری ایسی بچّی تھی۔ پوتی کے سوکھے ہونٹ اور ہاتھ پاؤں ہلاتے دیکھ ان کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ پریشان ہو کر پاپا پر برس پڑیں کہ کیسا ڈاکٹر ہے۔ بہو کو اچھی سی دوا نہیں دے سکتا۔ اچھا یہی ہے۔ بڑے حکیم جی کو بُلا لیا جائے۔ نانی الگ گم صم تھیں۔ سمدھن کو مشورہ دیا کہ گائے کا دودھ منگوالیں۔ ننھی جان کو کچھ دینا ہی پڑے گا۔ دادی چاہ رہی تھیں بکری کا دودھ بہتر رہیگا۔ دونوں پرانے وقت کی گھِسی پِٹی ممتا کا دامن تھامے تھیں۔ راجدھانی کے سب سے بڑے میٹرنیٹی ہاسپٹل میں پاپا کی کئی ہم جماعت لیڈی ڈاکٹرس تھیں۔ سفارت خانوں کی لیڈیز بھی وہاں داخل ہونا پسند کرتی تھیں۔ وہ بھاگے بھاگے وہاں پہونچے اس رات کئی زچگیاں ہوئیں تھیں۔ چار زچاؤں کا سیزیرین ہوا تھا۔ دو ایسی عورتیں تھیں جو میڈیکل جانچ کی وجہ سے بچّے کو دودھ نہیں پلا سکتی تھیں۔ پاپا خوشی سے پاگل ہو گئے۔ لیڈی ڈاکٹرس نے پمپ سے دودھ نکال کر ایک بوتل بھر دی۔ پاپا واپس لوٹے تو نپل والی چھوٹی بوتل ساتھ لائے۔ کچن میں گھنٹہ بھر خود ہی دودھ اُبالا۔ ٹھنڈا کیا۔ دادی تماشہ دیکھتی رہیں کہ شاید دوائیں لایا ہوگا۔ پاپا نے جیسے ہی شمسہ کے منہ میں نپل دینی چاہی وہ بھڑک اٹھیں۔

''دودھ۔ کہاں سے اٹھا لایا۔ پاگل تو نہیں ہو گیا؟ نانی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ گھبرا کر بولیں۔

''یہ دودھ کس کا ہے؟

''اماں لیڈی ہاسپٹل سے لایا ہوں۔ بالکل تازہ ہے پاپا کو ساری کہانی سنانی پڑی۔

''ارے کم بخت! دونوں سر پیٹ کر بیٹھ گئیں۔ بحث چلتی رہی۔ آنکھوں دیکھی مکھی نہ کھانے کی ضد تھی۔ ایرے غیروں کا دودھ باپ دادا کی قبروں کی مٹی حرام کردے گا۔ زچہ کی نہ ذات کا پتہ نہ مذہب کا۔ خاندان والے اول فول بکیں گے۔ پاپا نے دادی کو ابا کے گروہ کا آپریشن یاد دلایا۔ بلڈ بینک سے چار بوتلیں لینا پڑیں۔ خون چڑھوایا۔ تب آپریشن کامیاب ہوا۔ اس وقت کسی نے خون کی ذات اور مذہب کا سراغ نہیں لگایا۔

منجھلے بھیا نے ہوش وحواس کے دنوں سے کالج چھوڑنے تک چھیڑ خانی جاری رکھی کہ لومڑی کا دودھ پی کر مسٹنڈی ہو رہی ہے۔ وہ خاموش رہتی لیکن اس غم کی آنچ میں تپتی رہی کہ امّی کے پستانوں کی لذت اور لمس سے اس کے ہونٹ محروم رہے۔ تین مہینے پاپا اسی طرح دودھ کا انتظام کرتے رہے۔ جب اُن کا تبادلہ دوسرے شہر میں ہوگیا تو دادی نے چیف میڈیکل آفیسر اونکار سرن مشرا کی گائے کا دودھ پلانا شروع کردیا تھا۔ پاپا نے اس کے بورڈنگ میں ملازمت پانے تک نہیں بتایا کہ وہ مقدس زچائیں کون تھیں جن کی امرت دھارا نے آج کی رات اسے بچوں کی زندگی کی حفاظت کی خاطر یمدوت سے زور آزمائی کی طاقت دی۔ موت کے دہانے پر کھڑے رہتے اس نے ۳۵ سال کے اوراق پلٹ لئے۔

بچوں کو گہری نیند نے چتاؤں کی لپٹوں کے تصور سے نجات دی تو شمہ دھیمے سے اٹھی اور عیسیٰ مسیح کی قد آدم تصویر کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ ان کی حیات بخش آنکھوں میں جھانکنے لگی جو مُردوں کو جلا دیا کرتی تھیں۔ اس کا ہراساں رُواں رُواں بیگناہ بچوں کے جینے کی تمنا اور اپنے مرجانے کی دُعا مانگنے لگا۔

''اللہ کے نبی۔ آپ میں اللہ کی روح ہے۔ یہ بچے بی بی مریم کی

آنکھوں کا نور ہیں۔ان کی حفاظت فرمائیں‘‘

اوپری منزل کے نیچے وسیع ریسپشن ہال تھا۔ بلوط کی لکڑی کا بڑا کاؤنٹر اور چار الماریوں میں بورڈنگ کے طالب علموں کی فائلیں تھیں۔ یونیفارمس اور گھریلو کپڑے تھے۔شمسہ نے محسوس کیا کہ کمرے کا فرش کچھ گرم سا ہو رہا ہے۔اب یقینی طور پر شبخون مارے جانے کو تھا۔کاؤنٹر اور الماریاں جلائی جا چکی تھیں۔گویا سب کی چتائیں تیار کر لی گئی تھیں۔وہ بزدلی کے اس حربہ سے سہم گئی۔بیس لڑکوں اور خود کا جیون موت کی طرف رینگ رہا تھا۔

شمسہ نے سر جھکا اور تیزی سے بچّوں کی طرف لپکی۔اُس نے پانی سے بھری بالٹی اٹھائی اور ان کے اردگرد پانی انڈیلنے لگی۔ پانی کا حصار یونیفارمس میں جذب ہو گیا۔ تپش سے راحت ملی ہو گی کیونکہ وہ پہلے جیسے ہی نیند میں مدہوش تھے۔ذرا بھی نہیں ہلے۔

شمسہ نے ایک بار پھر کھڑکی سے جھانکنے کی ہمت جٹائی اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ بیتے تین دن سے گرجا کا بھاری گھنٹہ خاموش تھا۔کبھی اس کی آواز میلوں دور تک زندگی کا نغمہ بکھیرتی تھی۔سُلگتی آگ اور دھوئیں میں گرجے کا بلندِ مینار سالخوردہ کھوکھلے درخت جیسا تھا۔جس پر اُلّو بھی پَر سمیٹنے سے ہچکچاتا ہو گا۔ باہر کمپاؤنڈ کے میدان میں مچھر نما وحشی نے شاید شمسہ کا سایہ کھڑکی میں دیکھ لیا اور وہ ڈراؤنی آواز میں چیخا۔

’’آؤ۔آؤ۔ماں کا دودھ پیا ہو تو میرے سامنے۔ نیچے آؤ!‘‘

کمرے تلے بلوط کی بھڑکتی آگ سے گھبرائے بلوائی باہر میدان میں آ گئے تھے۔وہ پسینہ میں تربتر تھے۔شمسہ کی حالت اس راکھ جیسی ہو گئی جو نہ جل سکتی تھی اور نہ ہی بجھ سکتی تھی۔اس نے کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ ایڈمرل ٹوگو، جنرل نوگی،عیسیٰ مسیح۔ رام لکشمن اور اللہ کے نام نے ابھی تک کوئی اثر نہیں دکھایا۔اس کے دل اور دماغ نے فیصلہ کن قدم اٹھانے کا ارادہ کیا اور گلا پھاڑ کر چلائی۔

''ہاں میں نے ماں کا دودھ پیا ہے۔ میں آ رہی ہوں''

شمسہ نے کیروسن اسٹو اٹھایا اور پانی کی خالی بوتل میں سارا تیل انڈیل لیا۔ بچوں پر فخر سے الوداعی نگاہ ڈالی۔

''میڈم آخری سانس تک تمھاری رَکشا کریگی''!

زینہ کا دروازہ کھولا۔ ساڑی کا پلو کمر سے کس کر باندھا۔ سنبھل سنبھل کے ایک ایک سیڑھی اُترتی گئی۔ رسپشن ہال میں اٹھتی لپٹوں سے بچتی بچاتی باہر میدان میں آ گئی۔ تیل کی بوتل کی گردن مٹھی میں مضبوطی سے پکڑی اور صدیوں پرانی چنوتی کو گھن گرج سے زندہ کیا۔

''ہے تمھارا کوئی سورما جو میرا مقابلہ کرنے سامنے آئے''! خون کے پیاسے دنگ رہ گئے۔ انھوں نے ''درگا کی مورتی دیکھی تھی۔ دیوی کا ایسا زندہ روپ سپنے میں بھی نہ آیا ہوگا'' بلوائیوں کے سردار نے آب دار ترشول بلند کیا اور مرکھنے سانڈ کے انداز میں شمسہ کی چھاتی چیرنے لپکا۔ دوسروں نے جلتی مشعلیں شمسہ پر اچھال دیں۔ اس کی ساڑی نے آگ پکڑ لی اور جیسے ہی ترشول شمسہ کے پیٹ میں گھسا اس کے حلق سے دردناک چیخ نکلی۔

''یا علی کر مدد''! وہ جھپٹ کر سردار سے لپٹ گئی اور تیل سے بھری بوتل اس پر خالی کر دی۔ پل بھر میں دونوں کو آسمان چھوتے شعلوں نے چھپا لیا۔!

☆☆☆

کتبے کی فریاد

میں تین سال بعد دُبئی سے لوٹا تھا۔ چھوٹی بہن کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے دل میں خوشیوں کا طوفان اُمنڈ رہا تھا۔ پندرہ دن کی رُخصت منظور ہوئی اور پہلی فلائٹ سے تحفوں کے دو سوٹ کیس سنبھالے اپنے وطن کو روانہ ہو گیا۔ گھر والوں سے دیوانہ وار ملا، یار دوستوں کی خوب خبر لی اور پھر بڑے قبرستان میں ابا جی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے پہونچا۔ وہاں کی صورت بالکل بدل گئی تھی۔ گورکنوں کے بے ترتیب مکان ،ان کے رشتہ داروں اور لنگوٹیوں کے ناجائز قبضے، جواریوں اور نشیلوں کے مسکن یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے تھے۔ مُردوں کی ہڈیاں چوبیس گھنٹے گناہوں تلے دبی رہتی تھیں۔ دو پہر میں آگ برساتے سورج کی روشنی سنگ مرمر کے چھوٹے کتبوں کے لفظ لفظ کو اُجاگر کرتیں تو لگتا جیسے صاحب ثروت ڈھانچے لمحہ بھر کو اٹھ کھڑے ہوں۔ ہر سو جھاڑ جھنکار اور پولی تھین کی تھیلیاں۔ قبروں کو پھلانگنے کی کوشش میں پائجامے کانٹوں سے اُلجھ کے چھلنی ہو جاتے۔ مگر اب سارا نقشہ بدل گیا تھا۔

آج وہاں داخل ہوا تو احساس ہوا کسی باغ میں آ گیا۔ صاف صفائی دیکھنے لائق تھی۔ جھاڑیوں کا نام ونشان نہیں تھا۔ املی اور شریفوں کی بے ترتیب پتّے گراتی شاخوں کی سلیقہ سے کٹنگ کی گئی تھی۔ بجلی کے کھمبوں پر واپر لیمپ لگے تھے۔ کنکریٹ کی پگڈنڈیوں کا چاروں طرف جال بچھا ہوا تھا۔ ڈراؤنا اور آسیبی ماحول کافور ہو چکا تھا۔ میں ٹہلتا ہوا مشرقی کونے کی طرف بڑھتا گیا۔ کئی بچھڑے ہوئے دوستوں اور شہر کی ممتاز

شخصیتوں سے کتبوں نے روشناس کرایا۔ ابا کی قبر پر خاموش کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی۔ بیتی یادوں نے دل میں اُبال پیدا کر دیا۔ بے تحاشہ آنسو بہنے لگے۔ میں ان کی اولاد نرینہ اور وہ مجھے پیار کرتے نہیں تھکتے تھے۔ میری ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم پر پیسہ کا منہ نہیں دیکھا۔ دُبئی، کوویت اور سعودی عرب میں کئی اداروں میں ملازمت کے لیے درخواستیں بھجوائیں۔ ابا جی کی دلی خواہش تھی کہ سعودی عرب کے نوکری مل جائے۔ وہاں میرے پاس رہتے حج کر لیں گے۔ دیارِ رسول پر ہاتھ پھیلا لیں گے۔ مگر ان کی تمنّا پوری نہ ہوسکی۔ آنکھیں ہمیشہ کے لیے موند لیں اور ایک سال بعد مجھے دُبئی میں ملازمت مل گئی۔ فاتحہ سے لوٹتے ہوئے بائیں طرف ایک قبر کے کتبہ نے میرے قدم روک لیے اس کی تحریر دل میں پیوست ہوگئی۔

''کلّ مَن علیه فان''

زلیخا جان زوجہ سردار سنگھ ہارمونیم ماسٹر

تاریخ وفات ۱۴ رمئی ۱۹۷۱ء

میں حیرت سے ہر لفظ کو دیکھتا رہا۔ پھر نظریں بغل والی بوسیدہ قبر پر ٹِک گئیں۔ دائیں بائیں، سرہانے اور پاؤں کی طرف فرشی والے پتھر مٹی کے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔ دماغ کی پرتیں کھلتی گئیں۔ بھولی بسری کہانی کے نقش و نگار اُبھرنے لگے۔

میں کالج سے لوٹ رہا تھا۔ دن کے دو بجے تھے۔ میرا قبرستان کی مین روڈ سے گذر کر کالج آنا جانا تھا۔ قبرستان کے گیٹ پر بھیڑ جمع تھی۔ غصیلی آواز میں کچھ داڑھی والے بزرگ اور نوجوان لڑکے بحث کر رہے تھے۔ چہروں پر جلال اور آنکھوں میں مر مٹنے کی تڑپ جھلک رہی تھی۔ میں نزدیک گیا اور رُک کر معاملہ کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ زمین پر جنازہ رکھا ہوا تھا۔

''یہ میّت ہرگز یہاں دفن نہیں ہوگی''!

ہمت کیسے ہوئی۔ ''تم لوگ گمراہ ہو گئے ہو۔''

''ہمارے بزرگ یہاں دفن ہیں''!

''لے جاؤ۔فوراً اٹھاؤ اور شمشان میں جلادو''!

یہ بھی بتادوں کہ کالج ،قبرستان اور طوائفوں کے ناز وغمزے کے مرکز مشکل سے ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک دوسرے سے نزدیک تھے۔مجمع میں میرا ہم جماعت عارف بھی موجود تھا جو نہ صرف اسی علاقہ کا رہنے والا تھا بلکہ دلیر اور سورما ٹائپ کا نوجوان تھا۔شہر میں دور دور کے اسکول کالجوں میں اس کے نام کی دھوم تھی۔ میں نے اسے قریب بلایا اور ماجرا جاننے کی پہل کی تھی کہ ایک صاحب حیثیت دکھائی پڑنے والے بزرگ اونچی آواز میں بولے۔

''آپ سب یہاں رکیں میں تین حضرات کے ساتھ ججّن خالہ سے مل کرآتا ہوں''

ججّن خالہ صوفیانہ مزاج کی متقی پرہیز گار خاتون تھیں۔ان کے شوہر تبلیغی جماعت کے امیر اور پیشہ سے چاول کے بڑے تاجر تھے۔طوائفوں کوشہر کے اس بارونق علاقہ سے بیدخل کرنے اور شہر سے باہر بسانے کی مہم تشدّد کا رخ اپنانے لگی تو ججّن خالہ نے مذہبی پاکیزگی کا مرہم لگایا۔گناہ آلودہ زندگی ترک کرنے کے لیے دن رات ایک ایک کوٹھے پر گھنٹوں درس دیئے۔نماز قرآن کی برکتوں جنّت کی راحتوں اور دوزخ کی اذیتوں کا بیان کر کے ججّن خالہ نے بدی کے راستہ سے شوخ حسیناؤں کو نیکی کی طرف راغب کر ہی لیا۔زیادہ تر طوائفیں اٹاوہ اور باندہ کی رہنے والی تھیں۔ کچھ تو مال و اسباب فروخت کرے لوٹ گئیں۔ چار چھ کوٹھا اتر کے کالونیوں کے فلیٹ میں منتقل ہوگئیں۔ججّن خالہ نے چھوٹی بزنس کرنے والے جماعتیوں سے ایک دو کا نکاح بھی پڑھوادیا۔

اس دن شام کو کالج میں تقاریر کا انٹر کالیجیٹ مقابلہ تھا۔ رات فرصت ملی تو عارف کا ہاتھ تھامے کافی ہاؤس لے گیا۔قریب دو گھنٹے قبرستان کے گیٹ پر رکھے جنازہ

کی داستان سنتا رہا۔ زلیخا باندہ سے آئی اور شہر کے سینکڑوں دلوں پر بجلی بن کر آ گری۔ مشکل سے ۱۸ ر سال کی عمر ہوگی۔ شباب اور شوخیوں کی اُمنگوں اور مچلتے فتنوں کا حسین پیکر تھی۔ سرخ ہونٹوں کے پیچھے سفید چمکیلے دانت ایسے کہ جن کے آگے آسمان کے تارے جگمگانا بھول جائیں اور آنکھیں غضب کا نشہ برساتیں۔ کمر چنبیلی کی کِھلتی کلیوں سے لہراتی شاخ، کولہے یوں گردش کرتے مانو گلاب کی ٹہنیاں ہوا سے ڈول رہی ہوں۔ کیا امیر کیا درمیانی طبقہ کے لوگ اور دادا ٹائپ بدمعاش۔ ہر ایک زلیخا پر دل و جان نچھاور کرنے کے لیے بیتاب ہوتا گیا۔

زلیخا کا کوٹھا شام ہوتے ہی ٹھسا ٹھس بھر جاتا۔ نوٹوں سے اٹی جیبیں رات دس بجے تک سکڑ کے رہ جاتیں۔ زلیخا کی ماں بانو دیکھتے ہی دیکھتے سونے کے بوجھ تلے دب گئی۔ زلیخا کے ساتھ ۲۵۔۳۰ سال کی عمر کا ہارمونیم ماسٹر سردار سنگھ بھی باندہ سے آیا تھا۔ گورا چٹا اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ یونیورسٹی میں بی۔ اے۔ کی تعلیم پوری کرتے کرتے زلیخا کی زلفوں کا شکار ہوگیا۔ کہا جاتا تھا وہ باندہ کے لکھ پتی راجپوت باپ کا بیٹا تھا۔ اور اس نے زلیخا کو پانے کے لیے گھر بار سے رشتے ناطے توڑ لیے تھے۔ ہارمونیم خریدا اور سُروں کی کھوج میں جگہ جگہ کے نامی استادوں کے پاؤں پکڑ لئے۔ تھوڑے عرصہ میں سردار سنگھ اس قابل ہوگیا کہ اُس کے ایک ہاتھ کی انگلیاں ہارمونیم کی ۳۶ ریڈس کی دھڑکنوں کو اس انداز سے نچانے لگیں مانو وہ تاج محل کے مرمریں کنگوروں کو سہلا رہا ہو۔ زلیخا کے مجرے اور اس کی سنگت کا ایک طرح سے چولی دامن کا ساتھ ہوگیا۔ دونوں نے ایک ساتھ ہی باندہ سے رام پور آنے کا فیصلہ کیا تھا۔

پٹھانوں کے شہر میں بڑے سیٹھ ساہوکار بھی شوقین مزاج تھے۔ محلوں حویلیوں میں دور دور سے ناچنے گانے والی آیا کرتی تھیں وہ کبھی رئیس جاگیرداروں کی خوشامد میں رات کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ ہیرے جواہرات اور سونا چاندی ان کی تجوریوں میں سمانے لگا۔ ایک دن وہ آیا کہ حویلی اور محل کے گروی نامے

بھی بہی کھاتوں میں درج ہو کر وجود کھونے لگے۔ گذرا زمانہ رہا ہوتا تو زلیخا کی نتھ اتارنے کا حق شمشاد خان یا علی بہادر خاں کا ہوتا لیکن بانو کے کانوں میں مدن گوپال جوہری نے سنکھ پھونک دیا۔ ۵۰ ہزار میں سودا منظور ہوا۔ سردار سنگھ نے سنا تو سکتہ میں آ گیا۔ جسم کا خون ایک پل کو جم سا گیا اسے پھریری آئی اور سر سے پیر تک آگ سی لگ گئی۔ راجپوتی آن بان اور دلیری کی جوالا دہک اٹھی۔ وہ دندناتا ہوا بانو کے کوٹھے پر چڑھ آیا۔ بانو رات کی نیند پوری کرنے لحاف اوڑھے سو رہی تھی۔ اس نے خاموشی سے بڑے کمرہ کا پردہ اٹھایا۔ زلیخا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کرسی پر بیٹھی بال سنوار رہی تھی۔ سردار سنگھ کو خوشبو میں بسے کمرے میں ہلدی گھاٹ کی چھایا رقص کرتی نظر آئی۔ وہ دھیمی آواز میں بولا۔

''یہ فیصلہ تمھاری رضامندی سے ہو رہا ہے''

زلیخا گھبرا گئی۔ کنگھا ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ سردار سنگھ نے پہلے کبھی ایسے تیور نہیں دکھائے تھے۔ وہ ممناتی بھیڑ جیسا تھا۔ گویا آواز نکلنے سے حلق میں ڈھول سی بھر جاتی ہو۔ گردن اٹھتی تو آنکھیں زلیخا کے چہرے سے ہٹنے کا نام نہیں لیتیں۔ اس نے دلبرانہ انداز میں سردار سنگھ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ زلیخا کا کہنا تھا کہ بانو اس کی ماں ہے جو طوائف تھی اور نانی کا بھی یہی پیشہ تھا۔ خاندان میں ددھیال نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس لیے اس کا بھی جنم خود اس کی مرضی سے نہیں ہوا۔ کیونکہ طوائف کے جنم کا ادھیکار صرف ماں کی نتھ پر جڑے ہیروں سے طے ہوتا ہے۔

''دیکھو بے بی۔ سردار سنگھ جھنجھلاتے ہوئے بولا''

''میں نے اپنے پرکھوں کی شان شوکت، ماں باپ اور بہن بھائیوں کو صرف تمھاری خاطر ٹھکرایا ہے''!

زلیخا کچھ جواب دے پاتی کہ بانو بستر سے جیسی اٹھی ملگجے کپڑے بکھرے بال سمٹتی آنکھیں ملتی ہوئی وہاں آدھمکی اور سردار سنگھ کو زلیخا کے کمرہ میں دیکھتے ہی بھڑک گئی۔

''اے ماسٹر۔ تم اندر کیسے آئے؟ کس سے پوچھ کر بے بی کے بیڈ روم میں قدم رکھا؟ جاؤ۔ باہر نکل جاؤ۔!''

سردار سنگھ غصہ میں ضرور تھا لیکن موقع کی نزاکت کو سمجھ گیا۔ گلی کوچوں میں پٹھانوں کے مکان تھے۔ بانو کے ایک اشارے پر طوفان کھڑا کردیں گے۔ مدن گوپال جوہری نے جس دن زلیخا کی نتھ کے لیے بانو سے سودا کیا تھا اس دن ہی سے جگہ جگہ نفرت کے الاؤ جلنے لگے تھے۔ ہر ایک کی بھویں تنی ہوئی تھیں۔

سردار سنگھ، خاموشی سے باہر آیا اور زینہ اتر کر محلہ سے نکل گیا۔ وہ اس شام بھی کوٹھے پر آیا اور دیر رات تک زلیخا کی آواز میں ہارمونیم کے سُر گھولتا رہا۔ دسہرہ کے بعد تیسرے سوموار کو زلیخا کو پندرہ دن کے لیے مدن گوپال کے ساتھ جانا تھا۔ ایک دن پہلے حسبِ معمول سردار سنگھ ہارمونیم لئے اوپر آیا، پیچھے پیچھے رحیم طبلچی بھی تھا۔ مجرا سننے کے شائقین بڑھتے گئے۔ تھوڑی دیر میں سگریٹ کے دھوئیں، پان چبانے کے مختلف سُر تال اور شراب کی بُو نے ماحول کو گرما دیا۔ بانو مراد آبادی پاندان لیے بیٹھی کچھ خاص مہمانوں کی طرف مسکراہٹیں اچھال رہی تھی۔ تب دلوں پر بجلیاں گراتی اور ہر ایک کو جھک جھک آداب کرتے ہوئے زلیخا ہال میں آئی۔ لوگوں کے چہرے پر ہوسناک سائے لہرانے لگے۔ اچانک آگے بیٹھا ہوا ایک نوجوان اپنی جگہ سے اٹھا۔ نشہ میں لڑکھڑایا۔ سنبھلا اور تیزی سے پتلون کی جیب میں ٹھنسی ہوئی بوتل نکالی، اس کا ڈھکن کھولا اور آگے بڑھا پھر بوتل کا رقیق زلیخا کی طرف پھینک دیا۔ دھواں سا اٹھا اور کپڑا جلنے کی بو پھیلی۔ زلیخا نے ایسی دلدوز چیخ ماری جیسے اس کے چہرے اور آنکھوں پر دہکتے انگارے آ گرے ہوں۔ وہ ہاتھوں سے منہ چھپائے تڑپتی ہوئی قالین پر گر پڑی۔

''تیزاب۔ تیزاب'' لوگ گھبرا کے بیرونی دروازے کی طرف بھاگے۔ ہال میں بھگدڑ مچ گئی۔ پلک جھپکتے ہی ہال خالی ہوگیا۔ دوسروں کے ساتھ نوجوان بھی بھاگ چکا تھا۔ بانو سینہ کوٹتی زلیخا پر جھک گئی۔ سردار سنگھ ہکا بکا کھڑا تھا۔ رحیم طبلچی رونے لگا۔

''ارے ماسٹر۔ کھڑا کھڑا تماشہ دیکھ رہا ہے'' بانو آنسو بہاتے بولی۔

''چلو جلدی کرو۔ بے بی کو ہاسپٹل لے چلیں''

زلیخا بے ہوش تھی۔ اسکے دونوں ہاتھ جیسے گالوں سے چپک گئے ہوں۔ سردار سنگھ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھک کر ہاتھوں میں زلیخا کو اٹھالیا اور زینہ کی طرف دوڑا۔ بانو پیچھے پیچھے آئی۔ نیچے سینکڑوں لوگ اکٹھا ہو گئے تھے۔

ایک مہینہ زلیخا ہاسپٹل میں رہی۔ سردار سنگھ چوبیس گھنٹے وہیں رہا۔ زلیخا کی دونوں آنکھیں اپنا وجود کھو چکی تھیں۔ گہرے گڑھے سے تھے۔ معلوم ہوتا تھا گِدھوں نے نوچ لی ہوں۔ گل وگلنار چہرہ بری طرح جھلس گیا تھا۔ ایسا دکھائی دے رہا تھا کہ سمندر کی ریت پر بچّوں نے انگلیوں سے لکیریں کھینچ دیں۔ چہرہ اتنا ڈراؤنا اور بدنما ہوگیا تھا کہ بچّے تو بچّے اگر کوئی بڑا آدمی بھی دیکھ لیتا تو خوف سے پیشاب خارج ہو جاتا۔ آنسوؤں کی جگہ اس کی سسکیوں نے لے لی تھی۔ کوٹھے پر واپسی ہوئی تو سردار سنگھ گھر کے فرد کی طرح داخل ہوا۔ بانو سال بھر میں نارمل ہوگئی۔ اسے سردار سنگھ کی خدمت اور چاہت کا پورا احساس تھا۔ ایک دن سارے زیور اور نقد روپیہ لائی اور سردار سنگھ کے سامنے ڈھیر لگا دیا۔

زلیخا کو'' بمبئی لے چلیں۔ وہاں پلاسٹک سرجری کرائیں گے''!

''اماں۔ آنکھیں تو نہیں مل سکتیں۔ زلیخا کا حسن ضرور واپس آجائے گا۔ مگر اس کے جسم کے خریدار جینے نہیں دیں گے''!

''ایسی شکل صورت میں آس پڑوس والے بھی خوف کھاتے ہیں''!

''میرے لیے زلیخا پہلے بھی حور تھی اور آج بھی ہے۔ اماں میں اس سے شادی کرونگا''!

شہر بھر میں سردار سنگھ کی پیشکش لیلیٰ مجنوں کی کہانی جیسی مشہور ہوگئی۔ پٹھانوں میں چرچا تھا کہ وہ جیسا بھی ہو لیکن ہندو جوہری کے بستر پر لیٹنے سے زلیخا کو

بچایا تھا۔ جوہری بازار میں مشہور ہو گیا کہ سردار سنگھ نے ہی زلیخا پر تیزاب پھنکوایا تھا اور مجرم کو بھی کوٹھے سے فرار کرادیا۔

میت کو قبرستان میں دفن کرنے سے روکنے والے صاحب حیثیت بزرگ اور تینوں معزز شہری جگن خالہ سے مل کر لوٹ آئے تھے۔

''کہیئے۔ کیا فتویٰ دیا خالہ نے؟ عارف نے آگے بڑھ کر بزرگ سے پوچھا۔

''وہ فرماتی ہیں سردار سنگھ نے انکے سامنے کلمہ پڑھ کے اسلام قبول کرلیا تھا''

ایک بزرگ نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ سفید براق داڑھی چوڑی پیشانی پر سجدہ کا سیاہ نشان مجھے احساس کرا رہا تھا کہ زندگی بھر کی برائیوں اور ضمیر کی کمزوریوں کو چھو منتر کران بزرگ کو نیکی اور ایمان کی سند مل گئی۔ وہ بولے۔

''میں نے آج تک اسے نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ جگن خالہ سے اس کا نام بھی پوچھ لیتے''

وہ خاموش ہو گئے تو دوسرے صاحب نے کہا:

''سب فضول باتیں ہیں۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ چلئے قبر تیار ہے''

تابوت اٹھالیا گیا اور تدفین عمل میں آگئی۔

میں نے زلیخا جان زوجہ سردار سنگھ ہارمونیم ماسٹر کی قبر اور اس کی بغل والی بوسیدہ قبر پر بھی فاتحہ پڑھی۔ کیمرہ سے فوٹو کھینچا اور دیر تک سوچتا رہا کہ سیاست اور مذہب نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی لاکھ کوشش کی ہو لیکن محبت دونوں کو شکست دے گئی۔

☆☆☆

پاک دامنی

آندھی، طوفان، گھن گرج اور بادل تھے کہ پھٹے پڑ رہے تھے۔ لگتا تھا اُن میں بارود کا منوں ذخیرہ ہو اور کڑکتی بجلی فلیتے کا کام کر رہی تھی چھوٹا شہر، گھنی آبادی اور خوفزدہ مٹھی بھر لوگ ناگہانی سیلاب میں ہاتھ پاؤں چلا کر زندگی کے لرزتے بادبانوں کو بچانے میں مصروف تھے۔

شام کا اندھیرا تھا۔ چھ تابوت تیار تھے۔ صرف دائیں بائیں کے تختوں میں کیلیں ٹھوکنا باقی تھا۔ میتھیوز نے سرخ رنگ کے تولیہ سے پیشانی اور ہتھیلیوں کا پسینہ پونچھا، دیوار سے کمر نکائی۔ بڑے ہال میں نیلگری اور چیڑ کی لکڑیوں کے ڈھیر کو تھکی تھکی آنکھوں سے دیکھا۔ دو دن کی بھوک لاغری اور غنودگی کے سایہ میں یکا یک اسے تابوتوں کے پیچھے تیز روشنی کے جھماکے کا احساس ہوا۔ اس نے کئی بار آنکھیں جھپکائیں کہ شاید وہم ہے۔ ایک طرف خوف و دہشت اور دوسری طرف کمزوری کا غلبہ۔ ان حالات میں موت کا گمان نت نئے جلوے جگاتا ہے۔ کبھی ڈراؤنے لکڑ بھگے کے نوکیلے دانت تو کبھی میٹھے دودھ کی بہتی نہریں۔ خون میں بھیگی تلواریں اور کبھی پھول برساتے فرشتوں کی سی شکلیں۔! صبح صبح میتھیوز گھنٹہ بھر یوحنا عارف کے کشف و کرامات کی کتاب پڑھنے میں ڈوبا رہا۔ تب اسے کسی طرح کا ڈر اور ہراس نہیں تھا۔ یوحنا نے یسوع مسیح کو دیکھا۔ قریب رہے۔ وہ ولی اللہ تھے۔ انھیں غیبی حالات معلوم ہو جاتے تھے۔ ان کا

آنکھوں دیکھا بیان ابھی تک میتھیوز کے دماغ میں ہچکولے پیدا کر رہا تھا۔

''سونے کے سات چراغدان دیکھے اور ان کے بیچ میں آدم زاد سا ایک شخص جو پاؤں تک جامہ پہنے اور سونے کا سینہ بند باندھے ہوئے تھا۔ اس کے سر اور بال سفید اون بلکہ برف کی مانند سفید تھے آنکھیں آگ کا شعلہ اور پاؤں خالص پیتل کے سے تھے جو بھٹی میں تپایا گیا ہو۔ آواز زور کے پانی کی سی تھی۔ اس کے داہنے ہاتھ میں سات ستارے تھے اور منہ میں سے ایک دودھاری تلوار نکلی ہوئی تھی۔ چہرہ ایسا چمکتا جسے تیزی کے وقت آفتاب۔ میں اس کے قدموں میں مردہ سا گر پڑا۔ اس نے میرے سر پر داہنا ہاتھ رکھا اور کہا۔ ''خوف نہ کر۔ میں اول اور آخر اور زندہ ہوں۔ میں مر گیا تھا اور دیکھ ابدالآباد زندہ رہونگا۔ موت اور عالم ارواح کی کنجیاں میرے پاس ہیں''

رات بڑھتی گئی۔ ہال میں کیروسین کے جلتے لیمپ پر بیشمار پتنگے ناچ رہے تھے۔ سارما اداس اور فکرمندی لیمپ کے پاس آ کھڑی ہوئی جیسے وہ بھی پتنگوں کی طرح کسی روشنی کی چاہت میں ہو۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور گلابی رخساروں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ جگہ جگہ دائرے ابھر آئے تھے۔ ہاسپٹل میں سفید کپڑوں، سفید موزے اور جوتے پہنے وہ بیر بہوٹی نظر آتی تھی۔ ۴۸ گھنٹے گھر کی چہار دیواری میں قید کیا ہوئی بادلوں میں ڈھکے چاند کی طرح دھندلا گئی۔ اس کے خشک ہونٹ تھرتھرائے

''پاپا۔ اب کہاں جائیں'؟

شہر والوں کی عقل اور دل دونوں گناہ آلود ہو چکے تھے۔ جسے دیکھو بدگو اور

تکراری، کینہ پرور اور گمراہ۔ پاور ہاؤس بھی جل کر اندھیرے میں ڈوب گیا۔ ویرانی خاموشی اور دھواں اڑاتا سناٹا۔ دن میں نہ آفتاب کا جلال تھا اور نہ ہی رات میں مہتاب کا جمال۔ ادھر برگد کے پیڑ پر گدھوں کا ڈیرہ جن کی نکیلی کٹاری سی چونچیں کسی ماہر سرجن کے تیز نشتر کی طرح جلے ہوئے جسموں کی چیڑ پھاڑ کو بے قرار تھیں۔ قصائی باڑے میں چوپائے چاقو چھری سے محفوظ اطمینان سے جگالی کر رہے تھے۔ اسی لیے گدھوں کا قافلہ بھوک سے بیتاب انسانوں کی بستی کے بیچوں بیچ آیا اور ٹھہر گیا

''پاپا۔ کچھ بولیے نا! سارما پھر بدبدائی۔ میتھیوز ابھی تک تابوت کے پیچھے چمکے روشن جھماکہ میں کھویا ہوا تھا۔ بیٹی کی آواز سنی تو اس کی غنودگی اور تھکاوٹ کی کسک دور ہوگئی۔ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اٹھا اور انگڑائی لیتے ہوئے باقی کام پورا کرنے کا ارادہ کیا ہتھوڑی اٹھائی اور کیلوں کا ڈبہ میز پر رکھدیا۔

''دو دن سے بھوکی ہوں پاپا۔ گھر میں بلّی کی چھوڑی روٹی کے ٹکڑے رہ گئے ہیں''

میتھیوز کے ہونٹوں پر گھنٹوں بعد بجھتے دئے کی لَو جیسی مسکراہٹ لہرائی۔

''انھیں ہی چولہے پر چڑھادے۔ خدا کی دی ہر چیز نعمت ہے۔ شکر گذاری سے کھاؤ۔ اسکے کلام سے پاک ہوجاتی ہے!''

سارما خاموشی سے دوسرے کمرہ میں چلی گئی۔ لکڑی کے بڑے تختوں کو فیتے سے ناپنے اور چاک کا نشان مارتے ہوئے میتھیوز دھیرے سے بڑبڑایا۔

''اب کہاں ساگون اور شیشم کی لکڑی۔ ان پر سونا چڑھ گیا۔''

اس کے پاس اسٹاک میں چار تابوت تیار پڑے تھے۔ آبادی بھی کتنی تھی۔

کرسمس اور ایسٹر کے تہوار پر گنتی کرو تو مشکل سے شردھالوؤں کے پانچ سو سر شمار ہوتے جن میں مرد، عورت اور بچّے تھے۔ کہاں سال بھر میں دو تین موتیں ہوتی تھیں۔ لیکن ۴۸ گھنٹے میں چار نپٹ گئے اور آٹھ لاشوں کا پوسٹ مارٹ ہونا رہ گیا تھا۔ ہاسپٹل میں صرف دو ڈاکٹر تھے اس لیے میتھیوز کے پاس باقی تابوت بنانے کے لیے کافی وقت تھا۔ چہرہ کے لیے کانچ لگانے کو پادری نے منع کر دیا تھا۔ کیونکہ پیٹرول سے جلنے کی وجہ سے لاشیں کوئلہ ہوگئی تھیں۔ چہرے بھوت پریت سے ڈراؤنے لگتے تھے۔ میتھیوز نے ہاتھ چلانے شروع کر دیئے۔ ہتھوڑی، کیل اور لکڑی کی ملی جلی آواز ایسی تھی مانو دوڑ وڈ کٹر کسی درخت کے تنے پر کرخت چونچ مار رہا ہو۔

سانولا رنگ، متوسط قد و قامت، منحنی آواز اور پتلے پتلے ہونٹ والا جان میتھیوز اپنی بیوی کی موت کے بعد پابندی سے اتوار کے دن چرچ جانے لگا تھا۔ پانچ سال کی سارما کو گود میں لیے صاف ستھرے کپڑے پہنے کئی گھنٹے وہاں پادری سے کتابیں لے کر پڑھتا رہتا اور سارما کو بھی سمجھاتا۔ سب ہی جانتے تھے اس کے جد امجد نظام شاہی حکمرانوں کے آخری نظام حسنِ شاہ سوئم کے عہد حکومت میں ۱۶۳۰ء میں احمد نگر آئے تھے۔ معمولی سی کارپینٹری ان کا پیشہ تھا۔ انگریزوں کے زمانے میں نصیب ستاروں کو چومنے لگا۔ کمپنی بہادر کا خچّر ہانکنے والا ہو یا معمولی اردلی اور سپاہی، نوکری میں رہتے موت ہو جاتی تو شیشم یا ساگون کے تابوت میں دفنایا جاتا۔ بس شرط یہ تھی کہ چمڑی گوری ہو اور آنکھیں انگلینڈ میں کھولی ہوں۔ اسی وجہ سے میتھیوز نے ایک ہال اور چار کمروں کے مکان میں جب جوانی کا دامن تھاما تب ہال میں ساگون اور شیشم اتنا ہی رہ گیا تھا کہ تین تابوت بنائیں جا سکیں۔ نویں کلاس تک پڑھائی کی اور باپ کے ساتھ تابوت

سازی میں بھی مہارت حاصل کرلی۔ ماں بچپن میں چل بسی تھی۔ امتحان قریب آئے۔ باپ کو دل کا دورہ پڑا اور پانچ منٹ ہی میں وہ بے جان ہوگیا۔ میتھیوز نے کتاب کاپیاں پھینک دیں اور آنسو بہاتے ہوئے گھنٹہ بھر میں باپ کے لیے شیشم کا تابوت بنا لیا۔ وہ زیادہ وقت چرچ کی صاف صفائی اور چھوٹے سے باغ کی کیاریاں سنوارنے میں گذار دیتا۔ پادری کے زور دینے پر ایک ڈرائیور کی لڑکی سے شادی رچائی جو مشکل سے دو سال بھی نہیں چلی اور بیوی سارما کو جنم دے کر رخصت ہوگئی۔ اس کے لیے میتھیوز نے نیلگری کی لکڑی کا تابوت بنایا تھا۔ پالش بھی کیا اور بیلجیم کا سفید کانچ بھی لگایا جس میں سے بیوی کا خوبصورت ناک نقشہ، وہ آدھے گھنٹہ تک خاموش کھڑا دیکھتا رہا۔ بے جان چہرہ پر نرگس کی مانند شگفتگی تھی۔

''پاپا'' سارما چینی کے کٹورہ میں روٹی کے ٹکڑوں کا دلیہ بنالائی۔ ''لو کھالو۔۔۔۔ مجھے تو سوچ سوچ کے متلی ہوتی ہے۔۔۔!''

میتھیوز مسکرایا۔ سارما کے ہاتھ سے کٹورہ لے لیا اور چسکی لیتے لیتے جلدی سے پی گیا۔

''بہت مزیدار ہے بیٹی۔ یسوع مسیح کا نام لے اور صبر شکر سے پی جا۔ کب تک بھوکی رہیگی''

رات کے بھونچال کی بھنک بھی اس نے سارما کو پڑنے [illegible] تھی۔۔ بجے ہوگئے۔ دروازہ پر کسی نے زور سے دستک دی تھی۔ میتھیوز آری سے لکڑی چیر رہا تھا۔ پہلے سمجھا چرچ کا پیامبر آیا ہوگا۔ لیکن وہ ایسی بے دردی سے دروازہ نہیں پیٹتا۔ اس کا دل دھڑکا۔ بھونچال کے کارندے نہ ہوں۔ شیطان کی طرح تاریخ

میں گھر گھر سونگھتے پھرتے ہیں۔ پل بھر کو میتھیوز کے دماغ میں پادری کے الفاظ نے سر اٹھایا۔ اتوار کے بیان میں کہا تھا کہ اگر مسیح کے نام کی وجہ سے تمھاری ملامت کی جاتی ہے تو مبارک سمجھو۔ کیونکہ خدا کا روح تم پر سایہ کرتا ہے۔ جو تمھیں ستاتے ہیں ان کے واسطے برکت چاہو۔ دشمنوں سے محبت کرو۔ یوں تو میتھوز کے پرکھے چار سو سال سے اس شہر اور شہر والوں سے محبت ہی کرتے آئے تھے۔ وہ خدا کا نام لیکر کھڑا ہوا اور دروازہ کھول دیا۔ شراب کے بھبکے نے اس کے نتھنوں میں چنگاریاں سی بھر دیں۔ دو ہٹے کٹے جوان تھے آنکھوں میں شعلہ خیز غضبنا کی۔ چہروں پر پاگل کتے جیسی چڑ چڑاہٹ۔ انھوں نے نفرت سے زمین پر رکھے تابوتوں کی طرف دیکھا اور ان میں سے ایک نے منہ کھولا۔

''کل دن میں تین بجے ہم تابوت لائیں گے'' آواز ایسی ڈراؤنی معلوم ہوئی کہ بھیڑیا دانت نکالے چیخنے کی کوشش میں ہو۔ میتھیوز نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

''بھائی صاحب۔ تابوت میرے پاس تیار ہیں''

دوسرا ہنسا اور بولا

''زیادہ بات نہیں ہم دو لاشیں لے جائیں گے''!

پہلے والے نے قاتلانہ مشورہ دیا۔

''تیار ہو اور زندہ رہنا چاہتے ہو تو ڈولی بھی لے آئیں گے۔''

''اور یاد رکھو آئیں گے ضرور۔ سوچ وچار کرلو''

دونوں اسے گھورتے ہوئے واپس ہو گئے۔ دروازہ بند کر کے میتھیوز مردہ سے

قدم اٹھاتا لکڑی کے تختے پر آ بیٹھا۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے ہونٹ خشک ہوگئے۔ حلق میں مچھلی کے کانٹے چبھنے لگے۔ اسے خوف کے ساتھ ہی حیرت ہوئی کہ زمانہ کو کیا ہوگیا۔ پہلے ضرورت مند آتا تو مردے کی پیمائش لاتا اور تابوت اس کے گھر پہونچ جاتا تھا۔ اب نفرت اور درندگی کا تابوت ساتھ لائیں گے اور لاش رکھ کے لے جائیں گے۔ کافی دیر سر تھامے بیٹھے رہنے کے بعد اس کی سمجھ میں آیا وہ حیوان گر گے سارمتا کی جوانی کا تاوان وصول کرنے کی دھمکی دینے آئے تھے۔ برسوں میں رات کے دہشتناک ماحول میں میتھیوز کو پہلی بار خیال آیا کہ سارمتا عمر کے اس دائرہ میں داخل ہوچکی ہے جہاں قدم قدم پر سنپولیے پھَن مارنے کی مشق کرتے ہیں۔ وہ کافی دیر تک آنکھیں بند کئے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ تھک گیا تو اپنے کمرہ میں آیا اور لیٹ گیا۔ یکلخت ہزاروں ہزار سال پہلے کے بابل شہر کا وہ نظارہ یاد آیا جو اس نے انگریزی فلم میں دیکھا تھا۔ بغل کی سیٹ پر بیٹھی میتھیوز کی نو بیاہتا بیوی کی خوف زدہ چیخ نے ہال میں بیٹھے تماشائیوں کو بری طرح چونکا دیا تھا۔ سب ہی کی حیرت زدہ آنکھیں اس کی سیٹ کی طرف اٹھنے لگیں۔ فلم کا سین ہی ایسا تھا۔ ایک زلزلہ سا آیا۔ آسمان سے انگاروں کی بارش ہو رہی تھی۔ بابل شہر کے تین ٹکڑے ہوگئے اور غیب سے بھاری آواز آئی۔

''نافرمان، گناہگاروں اور بدکاروں پر عذاب نازل ہو رہا ہے۔
میری اُمت کے لوگوں شہر سے باہر نکل آؤ۔ بابل پر گرتی آفتوں میں
سے کوئی تم پر نہ آجائے''۔

بابل جیسا آباد شہر جو مہین کتانی، ارغوانی اور قرمزی کپڑے پہنے تھا۔ سونے جواہر اور موتیوں سے آراستہ تھا۔ اطلسی قالینوں سے سجے شبستانوں میں جوان

بدکاریاں مدہوش تھیں۔ گھڑی بھر میں اُجڑ گیا۔ کھنڈر ہوگیا۔اس رات بھی کمرہ میں میتھیوز کی آنکھوں سے نیند کافور تھی۔

صبح ہونے کو تھی۔ بیٹے کے دونوں شرابیوں کی زہریلی آواز کی سرسراہٹ پھن کاڑھنے لگی۔ اسے سارما کی فکر ہوئی۔ اور بے چینی سے بیٹی کے کمرے میں جھانک کر آہستہ سے بڑبڑایا۔

"بیٹی ہی۔ نیند نہیں آ رہی"

کمرہ میں چھائے دھندلکے میں اپنی بھٹکتی آنکھوں کو میچتا ہوا وہ ہال میں آ گیا۔

سارما ابھی تک سو رہی تھی۔ رات کو سوئی نہ ہوگی۔ دن کا ایک بجا تھا۔ میتھیوز نے خالی پیٹ پانی پیا اور ہونٹ پونچھنے کے بعد دوبارہ چاق و چوبند ہوگیا۔ اِدھر اُدھر پک جھپک کی اور لکڑی کے کباڑ میں سے برسوں پرانے ساگون اور شیشم کے تختے ڈھونڈ نکالے۔ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ اسے اطمینان ہوا۔ دماغ میں ہلچل ضرور تھی۔ رات کی وارننگ ختم ہونے میں دو گھنٹے باقی تھے۔ تختوں پر جمی دھول کپڑے سے صاف کی۔ فیتے سے پیمائش اور آری سے کاٹ چھانٹ پوری ہوئی تو کھٹا کھٹ کیلیں ٹھونک ساگون والا تابوت مکمل کرلیا۔ سارما کا تقرر ہوا تھا تب سروس بک میں اندراج کے لئے قد ناپا گیا تھا۔ سنڈل اتروا دیے تھے۔ دیوار سے سر لگایا اور پینسل سے نشان لگا دیا۔ بڑے بابو نے انچ ٹیپ سنبھالا نشان سے زمین تک اور غور سے دیکھتے ہوئے ماتحت کلرک کو آواز دی۔

"لکھو لو چار فیٹ آٹھ انچ"

میتھیوز کی یادداشت بیدار ہوئی اور اس نے شیشم کی لکڑی ناپی۔

''چارفٹ نواچ کوئی ہرج نہیں''

ہتھوڑی اور کیلوں کے سہارے یہ کام بھی پورا ہوگیا۔ کیلیں ٹھوکتے لمحہ بھر کو اسے احساس ہوا تھا کہ کیلیں اس کی چھاتی کے گوشت کے نیچے پسلیوں سے ٹکرا رہی ہیں۔ وہ ہاتھ جھاڑ تیزی سے کھڑا ہوگیا۔ اور دیوانہ وار سارمما کے کمرہ میں گھس گیا سارمما باتھ روم میں تھی۔ میتھیوز نے الماری میں سے مٹیالے پانی سے لبریز بوتل نکالی دو گلاس اٹھائے اور واپس آ گیا۔

پیچھے پیچھے سارمما بھی آ گئی۔ میتھیوز نے اسے بڑے پیار سے اپنے پاس بٹھایا۔

''بیٹی۔ میرا ارادہ تھا۔ تیری شادی پر دل کھول کے خرچ کرونگا۔ بلکہ خود کو بھی خرچ کردوں گا'' ''ایسا ہے بیٹی۔ میں تجھے پاک دامن کنواری کی مانند مسیح کے پاس حاضر کرنا چاہتا ہوں۔ میں ہرگز نہیں چاہونگا کہ میری نیک نیتی اور تیری پاکدامنی کو سانپ گمراہ کر دے''

وہ خاموش ہوا۔ بوتل کا ڈھکن کھولا اور دونوں گلاس بھر دیے۔ پہلے خود پیا اور دوسرا سارمما کی طرف بڑھایا۔

''پی جا بیٹی۔! بابل شہر تباہ ہونے سے بچ جائے گا!

''یہ کیا ہے پاپا؟''

''گنگا بس ہے۔ پچھلے سال پنڈت خوشی لال یاترا پر گیا تھا۔ میرے لیے بھی لے آیا!''

''اتنا مٹیالا پاپا۔ کیسی بد بو آ رہی ہے''!

''ضد نہ کر پی لے۔ آدمی گندہ ہو جائے تو پانی بھی ویسا ہی ہو جاتا ہے!''

میتھیوز کی آواز ڈوبتی گئی۔ اس کے پیر لڑکھڑائے اور سارتما نے ناک بند کر کے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ کچھ منٹ گذرے ہونگے کہ وہ چکرا کے شیشم کے تابوت پر جا گری۔ دروازہ بھاری ٹھوکروں سے چرمرا رہا تھا۔

☆☆☆

نعیم کوثر: آئینہ در آئینہ زندگی

نام	:	سید محی الدین اختر
قلمی نام	:	نعیم کوثر
پیدائش	:	۱۵ر دسمبر ۱۹۳۶ء بیگم گنج ضلع رائسین مدھیہ پردیش
وطن	:	بھوپال
والدین	:	سید علی کوثر چاند پوری۔ مستند حکیم اور اردو کے بلند قامت ادیب وافسانہ نگار/محترمہ فاطمہ کوثر (مرحومین)۔ چار بھائی شمیم کوثر، نسیم کوثر، نعیم کوثر اور ڈاکٹر حلیم کوثر۔ دو بہنیں صالحہ ظفر نظامی (مرحومہ) میمونہ سلطان اور صبیحہ الیاس۔
اعلیٰ تعلیم	:	۱۹۵۷ء۔ آگرہ یونیورسٹی سے بی کام اور ۱۹۶۲ء۔
ملازمت	:	مدھیہ پردیش ہاؤسنگ بورڈ بھوپال میں ایڈمنسٹریٹو افسر کی پوسٹ سے ۱۹۹۴ء میں ریٹائرڈ ہوئے۔
ادب سے وابستگی	:	والدِ محترم کے تخلیقی نظم وضبط سے شعور نے آگہی حاصل کی ذہن ادب کی کائنات سے روشن ہوا۔ محض 13 سال کی عمر میں پہلی کہانی ''یتیم بچے کی عید'' لکھی جو ۱۹۴۹ء میں ماہنامہ ''نونہال'' دہلی میں شائع ہوئی۔
ادبی سفر	:	۱۹۴۹ء بچوں کے لیے طویل کہانی (ناولٹ) ''ہونہار شہزادہ'' حاتمی پبلشنگ ہاؤس حیدرآباد نے کتابی شکل میں شائع کی۔ ☆ ۱۹۵۰ء سے ۲۰۰۷ء تک تقریباً ۶۵۰ افسانے لکھ چکے ہیں جن میں بیشتر ہندو پاک کے نمائندہ رسائل وجرائد میں شائع ہوکر نہ صرف عوام بلکہ مشاہیر اہلِ علم و ادب سے داد وتحسین پاتے رہے ہیں۔
ڈرامے	:	۷۱-۱۹۷۰ء۔ تقریباً دس ڈرامے معاشرتی واصلاحی لکھے جو

وقفے وقفے سے آل انڈیا ریڈیو کی بھوپال اردو سروس سے نشر کیے گئے ان ڈراموں میں صوتی اداکاری بھی کرتے رہے۔

افسانوی مجموعے : پہلا مجموعہ ''خوابوں کا مسیحا'' (کل ۱۹ افسانے) ۱۹۹۹ء دوسرا مجموعہ '' کال کوٹھری'' (کل ۱۸ افسانے) ۲۰۰۱ء اور اب تیسرا مجموعہ ''اقرارنامہ'' (کل ۱۴ افسانے) ۲۰۰۶ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع۔

صحافت : ۱۹۵۹ء بچوں کا ماہانہ رسالہ ''جگنو'' بھوپال سے اپنی ادارت میں شائع کیا اور کامل چالیس سال کی طویل خاموشی کے بعد ۲۰۰۱ء میں ''صدائے اردو'' جیسا ادبی اور معیاری پندرہ روزہ بھوپال سے جاری کیا جو سات سال کا طویل مگر انتہائی کامیاب سفر جاری رکھے ہوئے ہے ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر کے علاوہ امریکہ، انگلینڈ، ماریشس اور پاکستان کے اردو نواز ہاتھوں تک پہنچ رہا ہے۔

مزاج : اکھڑ اور خالص بھوپالی لہجہ۔ بے تکلف نجی محفلوں میں ضابطہ اخلاق غیر پابند زبان سے ادا ہوتے درشت جملے۔ مزاج شوریدہ سر اس وقت جب کوئی اردو زبان وادب پر حرف تراش ہو۔ مزاج وطبیعت میں انتہائی جذباتیت، اتنے مخلص کہ اپنوں کی تکلیف پر رو دیں اور ضرورت آنے پر اپنا آپ ہار جائیں۔

فردوس بریں گھر : پوتے پوتیوں، نواسہ نواسیوں کے معصوم قہقہوں اور دل کش شرارتوں سے جنت نشان بنا رہتا ہے۔
اے خدا اس گھر کو اس زمین پر اسی طرح جنت نشاں کیے رہنا۔

نعیم کوثر سے ملیے : ۳۱ رفردوس کاٹیج۔ شملہ ہلس بھوپال ۴۶۲۰۰۱۔ ایم۔ پی۔
فون:0755-2661576 موبائل:9893731471

(رشید انجم)

''اردو افسانہ آج پھر ایک
تاریخی موڑ پر آپہونچا۔ نعرے بازی
اس نے ترک کر دی ہے لیکن ان
نعروں کے پیچھے جو شور اور جذبہ تھا
اسے نئے افسانے نے اپنا ہمسفر اور
رہنما بنالیا ہے۔ اس نے اپنی آواز
پہچان لی ہے اور کرشن چندر سے
رفعت نواز تک .... ہر ایک اپنے
اپنے راستے اور اپنی اپنی منزل کی
تلاش میں ہے۔ انفرادیت کی تلاش
اور زندگی کی گہرائیوں میں اتر جانے
کی جستجو میں۔

عابد سہیل
ماہنامہ ''کتاب''، لکھنو افسانہ نمبر
جنوری ۱۹۶۴ء

تجرید اور تمثیل افسانہ نگار کے ہاتھ کے اوزار ہیں ان اوزاروں کے استعمال کا مطالبہ افسانہ کا موضوع کرتا ہے۔ ہر افسانہ میں ان کا استعمال ممکن نہیں۔ ان اوزاروں کا استعمال سخت مشکل کام ہے۔ لیکن یہی سخت مشکل کام ان دنوں جس آسانی سے ہو رہا ہے اس پر حیرت ہوتی ہے اور جدید افسانہ افسانہ ایک لطیف اور نازک فن ہے اور جدید افسانہ اپنے داخلی مطالبات کی وجہ سے ایسی براہ راست اپیل نہیں کرتا جو کرشن، بیدی اور منٹو کے افسانوں میں ملتی ہے۔ لیکن جدید اچھے افسانوں میں یہ کمی بڑی حد تک ایک طرح کی نغمگی سے پوری ہو جاتی ہے۔ کامیاب جدید افسانہ شعر سے قریب ہوتا ہے۔ لیکن جدیدیت کے نام پر لکھے جانے والے بیشتر افسانے افسانہ پن سے بھی عاری ہیں اور اس شعریت اور نغمگی سے بھی۔

عابد سہیل

اداریہ ماہنامہ ''کتاب''، لکھنؤ افسانہ نمبر اکتوبر ۱۹۷۰ء